ناہید سلطانہ اختر

کاش!

خدا کی اس بھری پُری دُنیا میں کُچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کو محبتیں بانٹنے اور اُن کے دُکھ سمیٹنے پر گویا مامور ہوتے ہیں۔ چاہے جانے اور دوسروں سے محبت سمیٹنے کے مقابلے میں یہ سراسر ایک ایثار طلب کام ہے اور اس میں ایک عجیب سی لذت انگیز اذیت پنہاں ہوتی ہے جس کی کسک وہی خال خال لوگ سہتے ہیں جو محبتوں کے رمز شناس ہوتے ہیں۔

والدین کی بیٹوں اور بیٹیوں سے محبت بھی ایسی ہی بے غرض چاہت کا ایک لازوال روپ ہوتی ہے مگر کہیں کہیں اولادِ نرینہ کا نہ ہونا والدین کی سب سے بڑی محرومی سمجھ لی جاتی ہے۔ ہمدردی کے بہ ظاہر معصوم مگراندر سے زہرناک تبصرے محرومی کے اس احساس کو اُبھار کر اس منزل پر پہنچا دیتے ہیں جہاں والدین بیٹیوں کے روپ میں بھی بیٹوں کو ہی پروان چڑھاتے ہیں۔ ایسی بیٹیاں عمل کے میدان میں اُترتی ہیں تو اُن کے گرد نت نئی اور دل گداز کہانیوں کا طلسم پھیلنے لگتا ہے جس میں اندھیرے اور اُجالے بہن بہن جنم لیتے ہیں۔

یہ دِل گداز داستان بھی ایسی ہی ایک لڑکی کی ہے جس نے بیٹے کے خواہش مند باپ کو یوں بیٹا بن کر دکھایا کہ اس سفر میں وہ اپنی اصل کو بھی فراموش کر بیٹھی۔ اپنی مہربان زندگی کے سارے حیات آفریں جذبے ذمہ داری کے اسی جہنم کا ایندھن بنا دیے۔ گیا وقت کسی کی زندگی میں لوٹ کر نہیں آتا مگر اس کے لیے لوٹ آیا... لیکن وہ خود کہاں تھی؟ وہ تو پیچھے بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے بیضوی آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنا دل کچے پھوڑے کی طرح دکھتا محسوس ہوا اور میں بے اختیار ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

سچ اور حقیقت عموماً دل خوش کن کب ہوتے ہیں!

مگر مجھے یہ خوف نہیں تھا کہ آئینہ جھوٹ بول رہا تھا۔ زندگی اور آئینے کو سچ ہی بولنا چاہیے۔ آئینے سے جھوٹی گواہی لینا تو میں عرصہ ہوا ترک کر چکی تھی۔ کمال کی چیز تھی ہیئر ڈائی بھی! عمر کے کئی سال بڑی رازداری سے گھٹا دیتی بلکہ چھپا دیتی۔ جو جانتے تھے، سو جانتے تھے۔ جو نہیں جانتے تھے، قیاس اور اندازوں سے کام چلاتے۔

امی جان کہا کرتی تھیں، جوانی کا اپنا روپ ہوتا ہے مگر ان دنوں امی جان کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں کب آتی تھیں۔ ان کے عجیب و غریب الفاظ، محاورے اور کہاوتیں تو میرے سر پر سے گزر جاتے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے الفاظ ڈھونڈ کر لاتی تھیں امی جان۔

کتنی ناسمجھ ہوا کرتی تھی ان دنوں میں!

ہماری اسکول لائبریری میں استانیوں کے لیے ایک ماہنامہ آیا کرتا تھا جس کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا "صرف بالغوں کے لیے" اور اس کے عین نیچے جلی حروف میں یہ الفاظ درج ہوتے "ہر ہر سطر فقرہ پارے"

اس رسالے کا تازہ شمارہ اسکول میں آتے ہی سب سے پہلے "بڑی آپا" یعنی ہیڈ مسٹریس کی میز پر پہنچتا پھر کچھ کے بعد دیگرے "آپاؤں" یعنی استانیوں کے ہاتھوں میں گردش کرنے لگتا۔ ان کے گھروں میں جاتا اور گھوم پھر کر بالآخر دوبارہ لائبریری میں پہنچ کر شیشے کے پٹ والی ایک مخصوص الماری کی زینت بن جاتا۔

شیشے کے پٹ والی الماری میں آراستہ اس رسالے کے پرانے شمارے اسکول کی ثانوی جماعتوں میں پڑھنے والی لڑکیوں کے لیے بہت کشش رکھتے تھے اور وہ چپکے چپکے للچائی ہوئی نظروں سے ان شماروں کو دیکھا کرتیں۔

لائبریری والی آپا باقی ساری آپاؤں سے چھوٹی تھیں اور ان میں سے بہت سی آپاؤں کی شاگرد رہ چکی تھیں۔ دو سال پہلے انہوں نے اسی اسکول سے میٹرک کیا تھا اور پھر وہیں لائبریرین لگ گئی تھیں۔ نویں دسویں جماعتوں کی بہت سی "باجیوں" سے ان کی دوستانہ بے تکلفی تھی بلکہ کئی "باجیاں" تو وقفے میں کینٹین سے چاٹ، دہی بھلوں یا پکوڑوں کی پلیٹیں لے کر لائبریری ہی میں جا بیٹھتیں اور لائبریری والی آپا کو اصرار کر کے اپنے ساتھ کھلاتیں پلاتیں۔

لائبریری والی آپا ان باجیوں کو جن سے ان کے دوستانہ مراسم

تھے' مذکورہ رسالے کے پرانے شمارے عارضاً دے دیتیں مگر ہدایت کرتیں کہ چھپا کر لے جائیں تاکہ بڑی آپا یا کوئی اور آپا نہ دیکھنے پائے کیوں کہ بڑی آپا کی طرف سے ممانعت تھی کہ یہ رسالہ طالبات کو ہرگز نہ دیا جائے۔

لائبریری والی آپا کے سایۂ کرم میں رہنے والی باجیاں اس رسالے کے پرانے شمارے اپنی گودوں میں دبکا کر اسکول کے احاطے میں کھڑے کہن سالہ' سایہ دار درختوں تلے بیٹھ کر نہ صرف خود پڑھتیں بلکہ اپنی سہیلیوں کو بھی پڑھواتیں اور کھسر پھسر کرتیں پھر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے منہ چھپا چھپا کر اور شرما شرما کر کھی کھی کرتیں۔

چھوٹی جماعتوں کی لڑکیاں ان باجیوں کو یوں ہنستے دیکھتیں تو ان کی نگاہوں میں ایک ندیدہ سا تجسس ہلکورے لینے لگتا اور وہ انہیں للچائی نظروں سے دیکھنے لگتیں۔

بڑی جماعتوں کی وہ لڑکیاں جو لائبریری والی آپا کی کرم فرمائی سے محروم رہتیں ان کے دلوں میں لائبریری والی آپا کے خلاف باغیانہ جذبات پکنے لگتے "کتنی بے ایمان ہیں لائبریری والی آپا! اپنی دوستوں کو تو دے دیتی ہیں' ہمیں نہیں دیتیں۔" ایسی لڑکیاں دانت پیستے ہوئے سوچتیں۔

ان کی اس بے ایمانی سے آپا اور بڑی آپا کو باخبر کردینے کے منصوبے بنائے جاتے مگر۔۔۔۔ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی جرأت کوئی نہ کرپاتا۔

میں ساتویں جماعت میں تھی جب مجھے پہلی مرتبہ اس رسالے کی ورق گردانی کا موقع ملا!

میں یوں تو اپنی جماعت کی چھوٹی لڑکیوں میں شامل تھی اور چھوٹی لڑکیوں کو باجیاں عموماً اپنے حلقے سے بارہ پتھر پرے ہی سمجھتی تھیں مگر جماعت کی ذہین ترین طالبہ ہونے کی وجہ سے میری بہت سی ہم جماعت اور کوڑھ مغز باجیوں کو میری کاپیوں سے نقل کرنے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ مسج بہار باجی بھی انہی میں شامل تھیں۔

بہار باجی کو ساتویں جماعت میں فیل ہوتے تین سال ہو چکے تھے اور ان کے ساتھ کی لڑکیاں دسویں جماعت میں پہنچ چکی تھیں۔ انہی میں سے بعض کے طفیل بہار باجی کو بھی ممنوعہ رسالہ اکثر پڑھنے کو مل جاتا تھا۔ بہار باجی ہی نے ایک روز مجھے میری سائنس کی کاپی سے سوالوں کے جوابات نقل کرنے کے عوض "رسالۂ ممنوعہ" پڑھنے کو دیا تھا!

میرا خیال تھا اس رسالے میں بری بری باتیں اور قابلِ اعتراض تصویریں ہوں گی مگر اس میں تو عشق و محبت کی کہانیاں تھیں' لطیفے تھے' کارٹون' اشتہارات اور بس!

میں نے سوچا ہوسکتا ہے اس شمارے میں کچھ نہ ہو' دوسرے شماروں میں "کچھ" ہو مگر بہار باجی سے کاپیوں کے عوض کئی شمارے پڑھ ڈالنے پر بھی مجھے ایسی ویسی کوئی بات نہ ملی۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ رسالہ چھاپنے والوں کا "ہر ہر سطر قہقہہ بار" ہونے کا دعویٰ بھی سفید جھوٹ محسوس ہوا۔

اس رسالے میں زیادہ تر باتیں تو ایسی تھیں جو امی جان کے محاوروں اور کہاوتوں کی طرح میرے سر پر سے گزر جاتی تھیں اور میں ہنس ہنس کر لوٹنا پوٹنا تو کجا مسکرا بھی نہ پاتی۔ پھول دار حاشیے کے اندر لکھی اس عبارت میں ہنسنے کا پہلو کہاں نکلتا تھا بھلا!

"عورت ایک معما ہے۔ جب وہ بچی ہو تو جوان نظر آنے کی کوشش کرتی ہے' جوان ہو تو بڑھاپے کو رشک سے دیکھتی ہے اور جب بوڑھی ہو تو جوانی کو یاد کرتی ہے۔"

یوں تو اور بھی ان گنت سطریں تھیں جنہیں پڑھ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ آخر ان میں ہنسی کی کیا بات! پھول دار حاشیہ بھی ایک شمارے میں بیسیوں عبارتوں کے چہار اطراف ہوتا تھا مگر یہ عبارت میری یادداشت میں بالخصوص اس لیے محفوظ رہ گئی تھی کہ جب وہ شمارہ مجھے پڑھنے کو ملا تو کسی پیش رو قاری نے اس عبارت کے پھول دار حاشیے کے گرداگرد سرخ روشنائی سے ایک اور حاشیہ کھینچنے کے علاوہ انتہائی باریک قلم سے بڑے نفیس خط میں لکھا ہوا تھا "جھٹلائی نہ جاسکنے والی حقیقت۔"

حقیقت!

مجھے نہ تو چھپی ہوئی عبارت پر ہنسی آسکی نہ باریک قلم سے نفیس خط میں لکھے فقرے کا مطلب سمجھ میں آیا۔ ویسے بھی مجھے اس عبارت کو یا اس فقرے کو سمجھنے کی تگ ودو کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو اپنے ماں باپ کا بیٹا تھی!

اس عبارت کی حقیقت مجھ پر برس ہا برس بعد آشکار ہوئی!

سفرِ حیات کی ایک طول طویل مسافت طے کرلینے کے بعد اب جب کبھی میں اپنے من میں سر نہوڑا کر گئے دنوں کو یاد کرنے اور سود وزیاں کا حساب کتاب نکالنے بیٹھتی ہوں تو اس عبارت کی بازگشت مجھے سرد آہ کھینچنے پر مجبور کردیتی ہے۔

اس عبارت کے معنی آغاز تا اختتام اتنی اچھی طرح میری سمجھ میں آچکے ہیں کہ آگہی کا کرب اکثر میری آنکھوں کو چھلک جانے پر مجبور کردیتا ہے۔ اس مختصر سی عبارت کا مفہوم برسوں کی طویل مسافت کے بعد مجھ پر کھلا۔

آہ! کیسی تلخ اور دل خراش تفسیر آشکار کی وقت نے مجھ پر

وقت! اللّٰہ کیسی چال چلتا ہے۔

جب میں چھوٹی تھی تو امی جان اکثر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا کرتی تھیں "مجھے اپنا بچپن کبھی کبھی بہت یاد آتا ہے۔"

امی جان کی بہت سی باتوں کی طرح یہ بات بھی میرے سر سے گزر جاتی اور میں حیران ہو کر سوچتی "امی جان کو اپنا بچپن بھلا کیوں یاد آتا ہے!"

مگر وقت نے مجھے امی جان کی اس بات کا مطلب بھی خوب اچھی طرح سمجھایا۔

○☆○

ہم چھ بہنیں تھیں۔ دو بہنیں مجھ سے بڑی تھیں اور تین مجھ سے چھوٹی۔ ہم سب بہنوں کو بھائی کی بہت خواہش تھی۔ امی جان کو بھی بیٹے کی انتہائی تمنا تھی۔

ابو جی کو بھی یقیناً رہی ہوگی مگر انہوں نے کبھی امی جان کو بھولے سے بھی یہ طعنہ نہیں دیا کہ وہ انہیں اولادِ نرینہ دینے سے محروم رہی تھیں۔ ہم بہنوں کو بھی انہوں نے بھائی سے محرومی کا احساس نہ ہونے دینے کی پوری کوشش کی بلکہ اگر کوئی اور امی جان کو یا ہمیں اس محرومی کا احساس دلانے کی کوشش بھی کرتا تو ابو جی کہتے "حبیبہ میری بیٹی نہیں' میرا بیٹا ہے...... حبیب بیٹا۔"

ابو جی کی بات میرا سر فخر سے اونچا کر دیتی اور میرے سینے میں آپ ہی آپ تناؤ سا پیدا ہو جاتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے میں واقعی ابو جی کا بیٹا ہوں...... حبیب بیٹا! میں خود کو اپنی باقی بہنوں کے مقابلے میں ممتاز باور کرنے لگتی۔

ابو جی کی طرف سے مجھے یہ اعزاز ملنے کی وجہ امی جان کے مطابق یہ تھی کہ اوپر تلے دو بہنوں کے بعد جب میں پیدا ہوئی اور لوگوں نے ابو اور امی کو مبارک باد کے بجائے دبی زبان سے پرسہ دیا تو ابو نے کہا "میرے لیے یہی بیٹا ہے۔"

میرے بعد آگے پیچھے تین بہنیں اور پیدا ہوئیں۔

ابو جی عمارتی رنگ و روغن تیار کرنے والی فیکٹری کے مالک تھے۔ ہوٹلوں کی طرح اگر فیکٹریوں کی درجہ بندی بھی ستاروں کی تعداد کے ذریعے ممکن ہوتی تو ابو جی کی فیکٹری ایک فور اسٹار فیکٹری کہی جا سکتی تھی۔ ابو جی ایک سیدھے سادے' دیانت دار اور قناعت پسند آدمی تھے۔ حصولِ دولت کو انہوں نے کبھی اپنا مطمحِ نظر نہیں بنایا۔ وہ کہا کرتے تھے' آدمی کو زیادہ کی ہوس نہیں کرنی چاہیے بس اتنے پیسے کی خواہش رکھنی چاہیے کہ عزت سے زندگی گزر جائے اور بچوں کے حقوق ادا ہو جائیں۔

ابو جی کو ہم سب بہنوں سے بے حد محبت تھی۔ وہ تعلیم نسواں کے حامی تھے اور انہوں نے ہم سب کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ حالاں کہ امی جان ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں کہ لڑکیوں کو زیادہ کیوں پڑھایا لکھایا جائے جبکہ پکانی تو انہیں ہنڈیا ہی ہے۔ مجھے یاد ہے امی جان کی اس بات پر ابو جی نے ایک مرتبہ ہنس کر کہا تھا "پڑھی لکھی لڑکی زیادہ مزے دار ہنڈیا پکاتی ہے۔"

بڑی آپا نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا تھا۔ منجھلی آپا نے آنرز کیا تھا۔ مجھ سے چھوٹی بہن رعنا نے ایم بی بی ایس کیا۔ رعنا سے چھوٹی سعدیہ نے بی ایس سی کیا تھا۔

سب سے چھوٹی شگفتہ فرسٹ ائیر میں تھی کہ چھوٹی پھوپو نے اپنے بیٹے کاشف سے جو ایم ایس کر کے آیا تھا اور دوبارہ امریکا جانا چاہتا تھا' شگفتہ کا رشتہ لینے کے لیے ہمارے گھر کی دہلیز لے لی اور ابو جی سے ہاں کروا کے ہی رہیں۔

میں نے بی کام کیا تھا۔ کامرس کی تعلیم حاصل کرنا میری اپنی چوائس نہیں تھی۔ یہ راستہ میرے لیے ابو جی نے متعین کیا تھا۔ اگر میں اپنے دل کی آواز پر کان دھرتی تو میرا دل تو فائن آرٹس کی طرف راغب تھا مگر مجھے تو اپنے دل کی خواہش سے زیادہ ابو جی کی خواہش کا احترام عزیز تھا سو میں نے بی کام کی ڈگری لی۔

ابو جی کا خیال تھا ' کامرس کی تعلیم مجھے کاروباری اسرار و رموز کو سمجھنے اور کاروبار کو صحیح طور پر سنبھالنے میں خاطر خواہ مدد دے گی۔

وہ بات جو میری پیدائش کے بعد ابو جی نے شاید امی جان کا دل رکھنے اور انہیں بہلانے اور شاید خود کو بھی سہارا دینے کی خاطر کہی تھی' میری زیست کا ایسا محور بنی کہ میں ساری زندگی اسی محور پر گھومتی رہی۔

ابو جی نے مجھے کبھی بیٹی نہیں کہا۔ ابو جی کو یوں تو ہم سبھی بہنوں سے بہت محبت تھی لیکن مجھ سے وہ خصوصی انسیت کا اظہار کرتے۔ شاید اس لیے کہ وہ مجھے بیٹی نہیں بیٹا کہا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے ہم بہنوں کے بچپن میں ابو جی میرے سوا باقی سب بہنوں کو سر یا پیشانی چوم کر پیار کرتے تھے مگر مجھے ابو جی ہمیشہ اپنی بانہوں کے درمیان لے کر سینے سے لگا کر کہتے "اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر ٹھنڈ پڑ جاتی ہے میرے سینے میں۔" میں اپنی بہنوں کو بڑے غرور سے دیکھنے لگتی۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میرے بچپن میں ابو جی میرے لیے بڑے چاؤ سے لڑکوں کے سے کپڑے خرید کر لایا کرتے تھے۔ امی جان میری بہنوں کے لیے رنگ برنگی فراکیں اور شلوار قمیص بناتیں مگر میرے لیے وہ بھی مردانہ وضع کے کُرتے پاجامے ہی سیتیں۔

پہلی بار نیلے رنگ کی فراک اور سفید شلوار میں نے اس وقت پہنی جب مجھے اسکول میں داخل کرایا گیا تاہم گھر میں بارہ تیرہ سال کی عمر تک لڑکوں کے سے کپڑے ہی پہنتی رہی۔

پرائمری اسکول پاس کرنے تک میں اپنے لیے صیغۂ مذکر استعمال کیا کرتی تھی۔ سیکنڈری اسکول میں پہنچنے کے بعد جب ایک روز میں نے کلاس میں موجود آپا سے پوچھا "آپا! میں پانی پینے جا سکتا ہوں۔" تو انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولیں۔ "کیا! کیا کہا؟"

"پپ.....پانی پینے جا سکتا ہوں؟" میں نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

آپا نے میرے سر پر ایک چپت لگائی اور بولیں "آپ لڑکی ہو کر ایسے کیوں بول رہی ہیں۔"

میری وہ ہم جماعت لڑکیاں جو پرائمری جماعتوں میں اسی بات پر اکثر میرا مذاق اڑاتی رہی تھیں' بولیں "آپا! یہ تو اسی طرح بولتی ہیں.....دوسری آپاؤں نے بھی منع کیا مگر....."

"کیوں؟ کیوں جی؟" آپا نے مجھے گھورا پھر بولیں "تمہارے گھر والے منع نہیں کرتے۔" میں نے نفی میں جواب دیا۔

"عجیب بات ہے!" آپا نے کہا پھر میری ہم جماعتوں سے مخاطب ہو کر بولیں "اب آئندہ اگر یہ اس طرح بولیں تو مجھے بتایئے گا آپ لوگ۔"

"ٹھیک ہے آپا۔" لڑکیوں نے یک آواز کہا۔

آپا نے مجھے گھورا اور بولیں "چلو سیٹ پر بیٹھو۔"

میں شرمندہ سی پلٹی اور اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔

مجھے اپنے لیے صیغۂ مؤنث استعمال کرنے کی عادی ہونے کے لیے اپنی زبان اور طبیعت پر بہت جبر کرنا پڑا۔ اس وقت تک سیکنڈری اسکول میں چھٹی جماعت کو پڑھانے والی استانیوں پر یہ بات کھل چکی تھی کہ میں ایک ذہین طالبہ تھی۔

O☆O

آٹھویں جماعت میں بین المدارس مقابلۂ مصوری میں، میں نے پہلا انعام حاصل کیا۔ نویں جماعت میں پہنچنے کے بعد مجھے سائنس سیکشن میں رکھا گیا۔ دسویں جماعت میں، میں نے فرسٹ ڈویژن اور بورڈ میں دسویں پوزیشن حاصل کی۔

میری استانیوں کا مشورہ یہ تھا کہ مجھے کالج میں سائنس پڑھنی چاہیے۔ ان کا خیال تھا میں ایک اچھی ڈاکٹر بھی بن سکتی ہوں اور انجینئر بھی۔

عزیز رشتے داروں نے بھی ابو جی اور امی جان کو میری بابت... کم و بیش یہی مشورہ دیا۔

میرا اپنا دل چاہتا تھا کہ میں تصویریں بناؤں، نظمیں لکھوں، مجسمے تراشوں اور اسی طرح کے نازک اور تخلیقی کام کروں۔

ابو جی نے کہا "بیٹے! سائنس وائنس پڑھ کے تم کیا کرو گی۔ فیکٹری سنبھالنے کے لیے تمہیں حساب کتاب کا ماہر ہونا چاہیے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ تم کامرس میں داخلہ لے لو۔"

"کامرس میں ابو جی؟"

"ہاں۔"

ابو جی مجھے پُرامید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے ابو جی۔" میں نے کہا۔

ابو نے میرا شانہ تھپتھپایا۔

ان دنوں لڑکیاں عموماً سائنس یا آرٹس کے مضامین پڑھتیں۔ کامرس خالصتاً مردانہ شعبہ سمجھا جاتا۔ لڑکیوں میں کامرس پڑھنے کا اتنا رواج نہیں تھا۔ شاذ و نادر ہی کوئی لڑکی اس شعبے میں تعلیم حاصل کرتی۔

کامرس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجھے ایک مخلوط تعلیمی ادارے میں داخلہ لینا پڑا۔ میری کلاس میں مجھ سمیت دو لڑکیاں تھیں باقی سب لڑکے۔

میرے بچپن میں ابو جی مجھے اکثر اپنے ساتھ باہر لے جایا کرتے تھے۔ جمعے کی باجماعت نماز اور عیدین کی نمازوں میں، میں کئی سال تک ان کے ساتھ شریک رہی۔ اکثر وہ مجھے اپنے ساتھ بازار بھی لے جاتے اور کبھی کبھار فیکٹری بھی۔

تعلیمی اداروں میں کبھی کبھار ایسے چھٹی کے دن بھی آجاتے ہیں جب باقی کاروبارِ حیات معمول کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ میرے کالج کے زمانے میں ابو جی ایسے چھٹی والے دنوں میں مجھے اپنے ساتھ فیکٹری لے جاتے اور مجھے کاروباری رموز و نکات میں شامل کرنے کی کوشش کرتے۔

ابو جی نے مجھے بتایا تھا کہ امی جان سے شادی کرنے سے کوئی برس بھر پہلے انہوں نے ایک بہت ہی چھوٹی سی جگہ پر بہت معمولی پیمانے پر رنگ سازی کا کام شروع کیا تھا۔ ان دنوں وہ خود ہی رنگ بناتے، خود ہی پیکنگ کرتے اور خود ہی مارکیٹنگ بھی کرتے مگر میرے کالج کے زمانے میں ہماری فیکٹری شہر کے ایک صنعتی علاقے میں ایک وسیع و عریض رقبے پر محیط تھی اور پروڈکشن سے مارکیٹنگ تک ہر شعبہ مخصوص افراد کے سپرد تھا۔

ابو جی کہا کرتے تھے "گھر ہو یا کاروبار، آدمی کو دیانت دار ہونا چاہیے۔ بددیانت آدمی کا رزق اللہ میاں کم کردیتے ہیں۔"

ابو جی ایک سیلف میڈ اور دیانت دار آدمی تھے، ایک چاہنے والے شوہر تھے اور اپنے فرائض کا احساس رکھنے والے شفیق باپ۔

جب میں بی کام سالِ اوّل میں پہنچی تو ابو جی شہر کے ایک نو آباد رہائشی علاقے میں کوٹھی کی تعمیر شروع کروا چکے تھے۔ ایک روز وہ مجھے زیرِ تعمیر کوٹھی دکھانے کے لیے لے گئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

"بیٹا! تمہاری بہنیں تو اپنے اپنے گھربار کی ہوجائیں گی۔ یہ گھر تمہارے لیے ہے...... صرف تمہارے لیے۔"

میں نے چونک کر ابو جی کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑگئی۔ کیا مطلب تھا ابو جی کا! کیا کہنا چاہتے تھے وہ!

ابو جی میرے تذبذب کو غالباً تاڑ گئے اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔

"صرف میرے لیے ابو جی!" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں..... صرف تمہارے لیے۔"

"مگر......" میں کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں ہاں بولو، رک کیوں گئیں!"

"اکیلے تو مجھے ڈر لگے گا اس گھر میں۔"

ابو جی منہ اوپر کرکے بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ میں ان کا منہ دیکھنے لگی۔

"ارے بھئی! تم ہماری بیٹی تھوڑی، بیٹا ہو..... بیٹے بھی کہیں ڈرتے ہیں بھلا۔" ابو جی بولے۔

میں جھینپ گئی۔

"بیٹا جی! تمہاری بہنیں رخصت ہو کر اپنے اپنے شوہروں کے گھر جائیں گی مگر تمہاری شادی ہم ایسے لڑکے سے کریں گے جو گھر داماد بن کر رہے۔"

مجھے بے ساختہ رافع کا خیال آیا۔

دبلا پتلا، دراز قامت اور تقریباً میرا ہی ہم عمر رافع کسی اور کالج سے آئی کام کے بعد بی کام کرنے کی غرض سے ہمارے کالج میں داخل ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن ناہموار ہوجاتی اور جب وہ کلاس میں نہ ہوتا تو میری نظریں اسے کمرے کی کھلی اور اَدھ کھلی کھڑکیوں سے باہر برآمدے اور کالج کے صحن میں ڈھونڈنے لگتیں۔ جس روز وہ کالج نہ آتا، مجھے زندگی ادھوری سی

معلوم ہونے لگتی۔

O☆O

کالج کا زمانہ بھی عجیب دور تھا!

کالج میں لڑکوں کی اکثریت تھی اور ہم لڑکیاں گنی چنی تعداد میں تھیں۔ پورے کالج میں کل سات لڑکیاں۔

انیتا میری واحد ہم جماعت لڑکی تھی۔ اس کی ماما اور پاپا دونوں ہی ڈاکٹر تھے اور بغرضِ ملازمت نیوبلی میں مقیم تھے۔ انیتا کا ایک چھوٹا بھائی اور ایک بہن بھی اپنے والدین کے ساتھ نیوبلی ہی میں تھے۔ انیتا بینکاری میں اپنا کیریئر بنانا چاہتی تھی اور حصولِ تعلیم کی خاطر پاکستان میں اپنی ایک آنٹی کے پاس رہ رہی تھی۔

انیتا اور میں ہم جماعت بھی تھے دوست اور راز داں بھی۔

جماعت کے کمرے میں ہمارے ہم جماعت لڑکوں کی نشستیں دائیں بائیں اتفاقاً لگی ہوتیں جب کہ ہم دونوں لڑکیوں کے لیے دو نشستیں انتہائی آگے عموماً اس طور پر مخصوص تھیں کہ اپنی نشستوں سے ہم پوری کلاس پر اور ہمارے ہم جماعت ہم دونوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔ جماعت میں ہمیں ہر لمحے یہ احساس رہتا کہ ہم دونوں اقلیت میں تھے اور اکثریت کے محورِ نظر! لیکچر کے دوران اگر ہمیں ایک دوسرے سے کوئی بات کرنا ہوتی تو ہم زبان کے بجائے اپنی نوٹ بک اور قلم استعمال کرتے۔

کمرے سے باہر بھی ہم دونوں دو ہنسوں کی جوڑی بنے اکٹھے گھومتے پھرتے۔ کامن روم، لائبریری، کینٹین، لان غرض ہر جگہ ہم اکٹھے ہی دیکھے جاتے۔

بی کام پارٹ ون کی کلاسیں شروع ہونے کے بعد انیتا ہی نے ایک روز ایک لیکچر کے دوران اپنی نوٹ بک پر قلم چلایا اور دھیرے سے مجھے ٹہوکا دے کر میری توجہ اپنی نوٹ بک کی طرف مبذول کرائی۔ اس نے لکھا ہوا تھا "بائیں طرف دوسری رو میں بیٹھا ایک لڑکا تمہیں گھور رہا ہے۔"

میں نے سٹپٹا کر بائیں طرف دوسری رو پر نظر ڈالی تو اس لڑکے کو اپنی طرف گھورتے پایا جسے دیکھ کر میرے دل میں میٹھی میٹھی سی ایک لہر دوڑ جایا کرتی تھی۔

"رافع!" لیکچرر نے کہا۔

"سر!" وہ چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

لیکچرر نے کوئی سوال پوچھا جس کا وہ جواب نہ دے سکا۔

بہرحال مجھے اس کا نام معلوم ہو گیا تھا، رافع!

اپنی نوٹ بک پر لکھے جملے کو قلم زد کرتے ہوئے انیتا نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور زیرِ لب مسکرا دی۔

"اپنی توجہ لیکچر پر رکھیے۔" لیکچرر نے رافع کو ذو معنی لہجے میں تنبیہہ کی۔

میں نے کن انکھیوں سے رافع کی طرف دیکھا۔

"سوری سر!" وہ جھینپ کر کان کھجاتے ہوئے بولا۔

"سِٹ ڈاؤن۔"

"تھینک یو سر۔"

واقفانِ احوال زیرِ لب مسکراتے ہوئے اور ناواقفانِ احوال بھی ہم دونوں ہی کو دیکھ رہے تھے۔

جماعت کے کمرے میں اکثر و بیشتر ہم دونوں لڑکیاں یوں ہی مرکزِ توجہ بن جایا کرتی تھیں۔

کمرے سے باہر ان دنوں یہ حال تھا کہ کالج کی گنی چنی لڑکیوں پر پورے کالج کی نظریں مرکوز ہوتیں۔ چھٹی کے بعد جب ہم اور ہمارے آس پاس کے اسکولوں اور کالجوں کی لڑکیاں سڑک پر نکلتیں تو فٹ پاتھ پر، بس اسٹاپ پر اور بسوں کے اندر ہم لڑکیاں ہی سب کی توجہ کا مرکز ہوتیں۔ خوش رنگ ملبوسات اور لپے پتے چہروں والی عورتوں کے بجائے ہمیں پُر شوق نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ ہمیں بس میں بیٹھ کر کالج کے درختوں سے توڑے ہوئے کتارے کھانا اور چٹخارے لینا دشوار ہو جاتا اور ہم ایک دوسرے کی اوٹ میں منہ چھپا کر چٹخارے لیتے اور کھی کھی کرتے۔ بس میں سفر کرتی عورتیں ہمیں دیکھ کر منہ بنانے لگتیں۔

اللہ کتنی بہت سی اور طرح طرح کی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان دنوں ہمیں!

ہر عمر کے مرد ہمیں اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھتے۔ ہم سے دس سال بڑی عمر تک کی عورتیں ہمیں یوں تیوری پر بل ڈال کر دیکھتیں جیسے در خورِ اعتنا نہ گردانتی ہوں مگر ان کی نگاہوں میں رشک ہلکورے لے رہا ہوتا۔ پختہ عمر کی عورتیں ہمیں اور ہماری شوخیوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتیں۔ بڑھیاں ہمیں دیکھ کر کبھی منہ بناتیں کبھی مسکرا دیتیں اور کبھی دبی دبی کھی کھی کر منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگتیں۔

اف اللہ! ان دنوں ہنسی بھی کتنی آیا کرتی تھی۔

کبھی کبھی تو بلا سبب ہی پیٹ میں ہنسی کے گولے سے اٹھنے لگتے۔ ہنستے ہنستے پورا جسم مرتعش ہو جاتا۔ یوں لگتا جیسے صرف لب نہیں پورا جسم کھلکھلا رہا ہو۔

بس میں کبھی کبھی تو ایک لڑکی کی ہنسی متعدی مرض کی طرح بس میں سوار تمام لڑکیوں میں پھیل جاتی اور مردانہ حصے سے کالج کے لڑکے شوخ فقرے اور آوازے کسنے لگتے۔

عورتیں ہمیں معترض نظروں سے دیکھنے لگتیں۔ ان کا بس نہ چلتا کہ ہمیں بس کی کھڑکیوں اور دروازے سے باہر اٹھا پھینکیں۔

ہمیں ان معترض نظروں سے خود کو بچانا اور چھپانا محال ہو جاتا۔ یوں لگتا جیسے بس میں سوار عورتیں اور مرد ہی نہیں ساری دنیا ہمیں گھور رہی ہو۔ سمجھ میں نہ آتا تھا ان دنوں کہ آخر ساری دنیا ہم لڑکیوں ہی کو کیوں گھورتی رہتی تھی!

O☆O

بی کام سالِ اوّل اپنے اختتام کی طرف گامزن تھا کہ انہی دنوں میری چھوٹی پھوپو نے اپنے بڑے بیٹے کاشف کے لیے میری سب سے چھوٹی بہن شگفتہ کا رشتہ مانگ کر امی جان اور ابو جی کو ایک

کشش ونچ میں ڈال دیا۔

ابوجی کی دو بہنیں تھیں اور دونوں ہی انہیں بے حد عزیز تھیں۔ چھوٹی پھوپو کا بڑا بیٹا کاشف ایم ایس کر کے آیا تھا اور امریکا میں مستقل قیام کی غرض سے واپس جانے کا خواہاں تھا۔ چھوٹی پھوپو نے گوری میموں کے ڈر سے اس کی شادی کا پکا ارادہ کرلیا اور ابوجی سے شگفتہ کا رشتہ مانگا۔

ابوجی اور امی جان کو کاشف پسند تھا مگر سب سے چھوٹی کو سب سے پہلے بیاہ دینے کا تو شاید انہوں نے کبھی بھولے سے بھی تصور نہ کیا تھا۔ منجھلی آپا کاشف کی ہم سن تھیں۔ امی اور ابوجی نے چاہا کہ پھوپو کاشف کی شادی ان سے کرلیں مگر پھوپو اور کاشف دونوں ہی کو شگفتہ پسند تھی۔ امی اور ابو متردد ہوئے تو پھوپو ہمارے گھر کی چوکھٹ پکڑ کر بیٹھ گئیں اور ابوجی سے ہاں کروا کے ہی اٹھیں۔

شگفتہ کی شادی کے ہنگاموں نے ہم سب کے معمولات میں خلل ڈال دیا۔ میں ہفتہ بھر کالج سے غیر حاضر رہی۔

جس رات شگفتہ رخصت ہوئی اس کے جانے کے بعد میں لحاف میں منہ دبائے صبح تک گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔

اس رات پہلی مرتبہ مجھے شگفتہ سے اپنی محبت کی گہرائی اور شدت کا اندازہ ہوا۔ اس کی شادی نے مجھے پہلی بار شدت سے اس حقیقت کا احساس بھی دلایا کہ ایک ہی گھر کے آنگن میں پلنے بڑھنے والی بہنوں کا ساتھ کتنا مختصر ہوتا ہے!

چھ میں اب ہم پانچ بہنیں رہ گئی تھیں بلکہ چار! مجھے تو ابوجی اپنا بیٹا کہا کرتے تھے۔

شگفتہ کی شادی کے سلسلے میں ہفتے بھر چھٹی کے بعد میں کالج گئی تو انیتا ٹوٹ کر ملی اور مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔

"پتا ہے تمہارے بغیر میں اکیلی پاگلوں کی طرح پھرتی تھی کالج میں۔" انیتا نے کہا۔

اپنی اہمیت کا یہ احساس اس وقت دو چند ہو گیا جب میں نے رافع کو گہری نظروں سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ میں اتنے دن کالج سے غیر حاضر کیوں رہی؟

تیز ہوا کے ایک جھونکے نے میرے بالوں کی اگلی لٹوں سے اٹھکیلی کر کے انہیں میرے ماتھے پر بکھیرنے کی کوشش کی تو میرا ہاتھ بے ساختہ اپنی پیشانی تک جا پہنچا۔

میرے ہاتھ کو حنا آلود دیکھ کر وہ چونک گیا! شاید..... شاید اس سے ضبط نہ ہو سکا۔

اس روز اپنا فری پیریڈ کامن روم میں گزارنے کے بعد جب انیتا اور میں کامن روم کی چق اٹھا کر باہر نکلے تو رافع کامن روم کے باہر راہ داری میں کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ راہ میں آگیا اور اس نے ہماری توجہ حاصل کرنے کو کہا "ایکسکیوز می۔"

ہم دونوں ٹھٹک گئے۔

"آپ کافی دنوں سے کالج نہیں آرہی تھیں۔" اس کے لہجے میں استفہام تھا، تجسس تھا، بے تابی تھی۔

"آپ کو مطلب۔" انیتا نے کہا۔

"جی..... ویسے ہی..... ویسے ہی پوچھ رہا ہوں..... کلاس میٹ ہوں آپ لوگوں کا خیریت پوچھ لینے میں کوئی حرج تو نہیں۔"

"میری سسٹر کی شادی تھی۔" میں نے بتایا۔

"آئی سی۔" وہ بہت مطمئن سا نظر آنے لگا۔

"اور کچھ؟" انیتا نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے اس سے کہا۔

"جی نہیں..... تھینک یو ویری مچ....." اس نے جلدی سے کہا اور دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں اڑسے بائیں میں فائل سنبھالے لمبے لمبے ڈگ بھرتا زینے کی طرف چلا گیا۔

انیتا نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا اور ٹھوکا دے کر بولی۔

"یہ کیوں کہا کہ سسٹر کی شادی ہوئی ہے۔"

"تو پھر کیا کہتی۔" میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"میں تو اس سے یہ کہنے والی تھی کہ تمہاری منگنی ہو گئی ہے۔"

"جھوٹ بولنے سے فائدہ؟"

"ذرا اس کا ری ایکشن تو دیکھتے۔"

"اسے بھلا کیا ری ایکٹ کرنا تھا۔" میں نے انیتا سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"اتنی معصوم بننے کی کوشش مت کرو۔" انیتا نے مجھے خالہ اماں کی طرح ڈانٹا۔ میں انیتا کا منہ دیکھنے لگی۔

"بے چارہ تمہاری غیر حاضری کے دوران سخت اداس رہا۔"

"تم تو حاضر تھیں، تم سے پوچھ لیتا۔"

"مجھ سے پوچھ لیتا تو آج تم سے کس بہانے مخاطب ہوتا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ تمہارا عاشق ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" میں نے ٹھٹک کر انیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور تم بنو مت۔" انیتا نے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ مجھے اپنے دل میں ایک میٹھی میٹھی سی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا۔

O☆O

ہمارے گھر کا ماحول بڑا متوازن اور معتدل تھا۔

امی جان اور ابوجی نے ہم سب بہنوں کو نہ کھلی چھٹی دی تھی نہ بے جا اور غیر ضروری پابندیاں عائد کی تھیں۔

امی اور ابوجی دونوں کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ ایک بات ایک مرتبہ ہمیں بتا اور سمجھا دیتے پھر توقع یہ رکھتے کہ ہم شکایت کا موقع نہ دیں اور دوبارہ کہنے سننے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

امی یا ابو کو جب ہم سے کوئی ضروری بات کرنی ہوتی تو عموماً کھانے کے وقت وہ ہم میں سے کسی کو بطور خاص مخاطب کیے بغیر ضروری ہدایت اجتماعی طور پر ہمارے گوش گزار کر دیتے۔ میں اسے اپنی اور اپنی بہنوں کی خوش قسمتی سمجھتی ہوں کہ ہم میں سے کسی نے امی اور ابوجی کو کسی بڑی مایوسی سے کبھی دوچار نہیں ہونے دیا اور

میں اسے بھی خدا کی مہربانی سمجھتی ہوں کہ اس نے ہمیں بہت سمجھدار ... والدین عطا کیے تھے جنہوں نے ہماری رہنمائی کے لیے کبھی سختی یا درشتی کو اپنا شعار نہیں بنایا اور کبھی ہم پر روایتی نوعیت کی پابندیاں عائد نہیں کیں۔

امی اور ابوجی کو ہم سب پر بھروسا اور اعتماد تھا اور ہم سبھی نے ان کے اعتماد کا بھرم رکھنے کی کوشش کی۔ مجھے بھولے سے بھی یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ہم بہنوں میں سے کسی نے امی یا ابوجی کو معمولی سا بھی دھوکا دینے کی کوشش کی ہو۔ ہم اپنے والدین کے سامنے کسی کتاب کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ کوئی پردہ کوئی راز کوئی اسرار نہیں تھا ان کے اور ہمارے درمیان۔

جب میں مخلوط تعلیمی ادارے میں داخل ہوئی تو امی جان نے کالج کے پہلے دن مجھ سے کہا تھا "حبیبہ بیٹے! تم لڑکوں کے ساتھ پڑھنے جا رہی ہو۔ خیال رکھنا کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے مجھے یا تمہارے ابوجی کو صدمہ پہنچے۔"

میں نے چپ چاپ امی کو دیکھا۔ میں بخوبی سمجھ رہی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں۔

"تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟" امی نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا "آپ فکر نہ کریں امی..... ویسے بھی میں ابوجی کی بیٹی نہیں 'بیٹا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ہو تو تم بیٹی ہی۔"

تب ہی ابوجی آ پہنچے اور بولے "کیا باتیں ہو رہی ہیں بھئی؟"

"سمجھا رہی ہوں کہ لڑکوں کا کالج ہو گا ذرا خیال سے رہے۔"

ابوجی نے بڑے بھروسے سے میری جانب دیکھا پھر امی جان سے بڑے وثوق اور غرور سے بولے "میرا بیٹا سمجھدار ہے۔"

مجھے ہر حال میں ابوجی کے اعتماد پر پورا اترنا تھا!

○☆○

ہم اپنے نئے گھر میں منتقل ہو چکے تھے۔

بڑی آپا انگریزی ادب میں ایم اے کر چکی تھیں اور لیکچرر شپ کرنا چاہتی تھیں۔ منجھلی آپا فائنل کے امتحانات سے فارغ ہوئی ہی تھیں کہ ان کے لیے ان کی ایک کلاس فیلو کے بھائی کا رشتہ آگیا۔ لڑکا انکم ٹیکس آفیسر تھا۔ خاندان اچھا تھا اور گھرانا بہت معقول۔ امی اور ابو کو رشتہ دینے میں کوئی تامل نہ تھا مگر بڑی آپا کی دل شکنی ہونے کے خیال سے امی اور ابو نے لڑکے والوں سے بڑی آپا کے لیے مناسب رشتہ ملنے تک کی مہلت چاہی۔ بڑی آپا کو پتا چلا تو انہوں نے امی جان سے خود بات کی اور کہا "آپ میری وجہ سے رابعہ کی شادی مت روکیں۔"

میرا خیال ہے یہ امی جان اور ابوجی کی تربیت کا ثمر تھا جس نے بڑی آپا کو امی سے دوٹوک بات کرنے کی نہ صرف ہمت دی بلکہ وہ ڈٹ بھی گئیں۔

میں ان دنوں بی کام فائنل میں تھی۔

منجھلی آپا کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ منجھلی آپا کی شادی سے نمٹ کر میں کالج گئی تو رافع کو مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوئی کیوں کہ اب میرے اور اس کے درمیان پہلے کی سی اجنبیت نہ رہی تھی۔ کالج یونین کے انتخابات میں لڑکیوں کے اصرار پر میں جوائنٹ سیکریٹری کے عہدے کے لیے امیدوار تھی اور اس موقع پر رافع نے میرے حق میں انتخابی مہم میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا تھا بلکہ میری خاطر مخالفین سے مار بھی کھائی تھی چناں چہ اس بار اسے کالج سے میری غیر حاضری کا سبب معلوم تھا۔

منجھلی آپا کی شادی کے بعد جب میں کالج گئی تو اس نے کہا۔

"تھینکس گاڈ! آپ آگئیں۔"

"بے چارے بہت افسردہ تھے تمہاری غیر حاضری سے۔" انیتا نے شوخی سے کہا پھر رافع سے بولی "بس آج چائے ڈیو ہو گئی آپ پر۔"

"جناب چائے نہیں' آپ چاہیں تو کافی پلوا سکتے ہیں ہم آپ کو۔" رافع نے کہا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ..... کون کافر ہے جو کافی سے انکار کرے گا۔" انیتا مسکرائی۔

"مگر کالج سے باہر چلنا پڑے گا کافی پینے کے لیے۔"

"کوئی بات نہیں۔" انیتا نے میری طرف تائید طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "چلو گی نا؟"

"نہیں" میں نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں؟" انیتا کا منہ لٹک گیا۔

"بس۔" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"آخر کیوں؟ حرج کیا ہے۔"

"کافی شاپ واکنگ ڈسٹینس پر تو ہے۔" رافع نے کہا۔

"نہیں" میں نے نفی میں سر ہلایا "کالج کی بات اور ہے..... باہر لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔"

"آئی ڈیم کیئر۔" انیتا نے منہ بنا کر کہا۔

"شاید اس لیے کہ....." میں کہتے کہتے رک گئی۔

"کہ؟" انیتا نے استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"بس مجھے اچھا نہیں لگے گا۔" حالاں کہ میں کہنا یہ چاہتی تھی کہ میں اپنے والدین کے بھروسے کو ہلکی سی بھی ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی۔

"اوکے۔" رافع بولا "اگر یہ نہیں جانا چاہتیں تو نہ سہی' کالج کینٹین کی چائے اور سموسے ہی چلیں گے..... کیوں حبیبہ؟"

"کالج کینٹین کی چائے اور سموسے تو چلیں گے نہیں' دوڑیں گے اور میری طرف سے دوڑیں گے' میری بہن کی شادی کی خوشی میں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہُرّے!" رافع نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے ہانک لگائی۔

آس پاس موجود طالب علم چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

ان کی نظروں میں اب وہ معنی خیزی مفقود ہو چکی تھی جو رافع سے میری دوستی کے ابتدائی دنوں میں ان کی نگاہوں میں ڈولنے لگتی تھی۔ سب سمجھ چکے تھے کہ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہ تھی اور یہ بات رافع بھی بخوبی سمجھتا تھا تبھی تو مجھ سے بات کرتے ہوئے وہ ایک خاص احتیاط روا رکھتا۔ اس کے دل میں خواہ کوئی بھی چور چھپا تھا' نگاہوں کی مجال نہ تھی کہ وہ دل کے اس چور کو تاک جھانک کا موقع دیں!

رہی میں تو اپنی نگاہوں پر ہی نہیں' دل پر بھی ایسا سخت پہرا رکھے ہوئے تھی کہ رافع کے بارے میں یہ معلومات بھی کہ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا' ایک بہن تھیں جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ناروے میں مقیم تھیں اور وہ ایک معمر ملازم کے ساتھ اپنے آبائی گھر میں رہتا تھا جس کا ایک حصہ کرائے پر اٹھا ہوا تھا اور وہی اس کا واحد ذریعۂ آمدن تھا' مجھے انیتا نے فراہم کی تھیں۔

O☆O

امی جان کہا کرتی تھیں' شادی لڑکی کو بھاری کر دیتی ہے۔

بھاری!

واقعی بعض لڑکیاں شادی کے بعد بہت بھاری بھرکم ہوتی دیکھی تھیں میں نے۔ میری اپنی سگی خالہ زاد بہن روشن شادی کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے گوشت کا تودہ بن گئی تھی۔

امی جان کی اس بات کے اصل معنی منجھلی آپا کی شادی کے بعد میری سمجھ میں آئے۔

منجھلی آپا تو وی آئی پی اور ان کے میاں شوکت علی صاحب وی وی آئی پی بن گئے ہمارے گھر کے لیے!

منجھلی آپا اور شوکت بھائی کے آتے ہی پورا گھرانا ان کے سواگت اور آؤ بھگت کو اٹھ کھڑا ہوتا۔ چائے کا وقت ہوتا تو قہوہ' دودھ اور چینی جرمن سلور کے ٹی سیٹ میں علیحدہ علیحدہ پیش کیے جاتے اور ریفریجریٹر میں موجود ہر نعمت ان کے سامنے چن دی جاتی۔ رعنا کے ہاتھ کے پکوڑوں کی شوکت بھائی کو ایسی چاٹ پڑی کہ چائے کے وقت پکوڑوں کی فرمائش ضرور کرتے۔ کھانے کا وقت ہوتا تو برتنوں کی الماری سے چائنا کراکری نکل آتی۔ امی جان اور ہم چاروں بہنیں شوکت بھائی اور منجھلی آپا کے سامنے بچھے بچھے رہتے۔

شوکت بھائی بہت خوش مزاج اور خوش لباس آدمی تھے۔ منجھلی آپا کی اور ان کی جوڑی بہت جچتی۔ دونوں میں محبت بھی بہت تھی۔

منجھلی آپا کی شادی کے چند ہفتوں بعد ہی بڑی آپا کو ایک کالج میں لیکچرر شپ مل گئی۔ انہی دنوں امریکا سے خبر آئی کہ شگفتہ جو امید سے ہونے کے باعث منجھلی آپا کی شادی پر پاکستان نہ آسکی تھی' ایک بیٹے کی ماں بن گئی تھی۔ اس خبر نے ہم سب کو انتہائی مسرور کیا۔ امی جان اور ابو جی نانی نانا اور ہم خالائیں بن گئے تھے!

شریر سعدیہ نے اس موقع پر مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"حبیبہ باجی! ابو جی سے کہیں اب وہ آپ کو اپنا بیٹا نہ کہا کریں۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر کہا۔

"آپ کے بھانجے بھانجیاں آپ کو ماموں نہ کہنا شروع کر دیں۔"

بڑی آپا اور رعنا قہقہہ مار کر ہنس دیں۔ امی جان نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ میں جھینپ سی گئی۔

"ویسے سعدیہ لائی تو ہے دور کی کوڑی۔" بڑی آپا کا قہقہہ تھما تو انہوں نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"بھئی باقی بہنوں کے بچے مجھے جو مرضی آئے کہیں' اس سعدیہ کی بچی کے بچوں سے تو میں خود کو ماموں ہی کہلواؤں گی۔" میں نے سعدیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"جناب! سعدیہ کی بچی کے بچے تو آپ کو نانا ابو کہیں گے۔" سعدیہ شوخی سے بولی۔

"بتاؤں!" میں نے سعدیہ کو دھپ لگانے کو ہاتھ اٹھایا۔

"بائی دی وے' یہ کون سا بتاؤں ہے' اردو والا یا پنجابی والا۔"

سب ایک بار پھر بے ساختہ ہنس پڑے۔ میری ہنسی بھی ان کی ہنسی میں شامل تھی۔

شگفتہ کے ہاں بچے کی پیدائش نے ہمیں ایک نئے رشتے کی محبت سے آشنا کیا۔

آنے والے دنوں میں اس بچے کی تصویریں ہمارے گھر کی زینت بنتی چلی گئیں!

O☆O

کالج کے آخری دنوں میں ایک روز کالج لائبریری میں رافع نے انیتا سے اس کے مستقبل کا پروگرام پوچھا تو وہ چہک کر بولی "پاپا نے میرے لیے نیپال میں بینک جاب تلاش کر رکھی ہے اور ماما نے ایک لڑکا' میں تو امتحان دیتے ہی نیپال چلی جاؤں گی۔"

"اور آپ..... آپ کا کیا پروگرام ہے؟" رافع نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے ڈیڈی کے ساتھ فیکٹری سنبھالنی ہے۔" میں نے بتایا۔

"اور ایک دن غڑاپ سے یہ رنگ کے کسی ڈبے میں ڈوبی ہوئی پائی جائیں گی۔" انیتا نے ہنس کر کہا۔

انیتا کی اس بات پر ہم دونوں میں سے کوئی ہنسا تو کجا مسکرایا تک نہیں۔ وہ خفیف سی ہو کر رہ گئی۔

"بائی دی وے' آپ کا کیا پروگرام ہے؟" انیتا نے رافع سے پوچھا۔

"فی الحال تو ایم کام کا ارادہ ہے پھر شاید کسی جگہ جاب کروں۔"

"شاید!" انیتا نے اس کا یہ لفظ پکڑ لیا۔

"جی ہاں" اس نے کہا۔

"شاید کیوں؟" انیتا نے پوچھا۔

"کیوں کہ ہم چاہتے کچھ ہیں' ہو کچھ جاتا ہے۔"

میری نگاہ آپ ہی آپ اس کی طرف اٹھ گئی۔ وہ دزدیدہ نظروں سے مجھی کو دیکھ رہا تھا!

واقعی ہم چاہتے کچھ ہیں' ہو کچھ جاتا ہے!

امی اور ابو تو بڑی آپا کے لیے مناسب بر کی تلاش میں تھے کہ منجھلی آپا اچانک بیوہ ہو گئیں! شوکت بھائی دفتر سے گھر واپس آرہے تھے کہ ان کی گاڑی کا ایک ٹرک سے تصادم ہو گیا اور وہ جائے حادثہ پر ہی۔۔۔۔!

منجھلی آپا کے ہاں جلد ہی بچے کی ولادت متوقع تھی۔ امی جان تو ان کے لیے شان دار چھوچھک تیار کر رہی تھیں۔ ہمارے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ منجھلی آپا کی کوکھ میں پلنے والا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی یتیم ہو جائے گا۔

ہم سب ذہنی طور پر بکھر کر رہ گئے۔ کہاں کا امتحان اور کس کا امتحان! میں نے ایک عجیب سی کیفیت میں پرچے دیے۔ ہمارا گھر محزون خاموشی میں ڈوب گیا تھا۔

شوکت بھائی کے انتقال کے نو دن بعد منجھلی آپا نے ایک بیٹی کو جنم دیا جس کا نام اس کے دادا نے "یادگار" رکھا!

امتحانات سے فراغت کے بعد میں نے ابو جی کے ساتھ فیکٹری جانا شروع کر دیا۔ منجھلی آپا کی عین شباب میں بیوگی نے امی جان ہی نہیں' ابو جی کو بھی ان دنوں گہرے صدمے اور ذہنی انتشار سے دوچار کر رکھا تھا۔ دونوں کو سہارے کی ضرورت تھی۔

منجھلی آپا غم و اندوہ کی تصویر بنی رہتیں۔

بہنیں جن کی کھکھلاہٹ اور چہچہے گھر میں رونق بکھیرے رکھتے تھے' کسی بات پر مسکرانے سے پہلے منجھلی آپا کی طرف دیکھتیں۔

منجھلی آپا کے خیال سے ہم سب بہنوں نے بہت دنوں تک نئے کپڑے بنانے سے گریز کیا۔ تقریبات میں آنا جانا کم رہا۔ عید آنسوؤں کی رم جھم میں گزری۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کی خوشیوں میں ہمارا کوٹا گھٹ گیا تھا۔

ہم سب یادگار کو سینے سے لگائے لگائے پھرتے۔ اس معصوم سی ننھی جان کو دیکھ کر ہمارے دل کٹنے لگتے۔ اس کا رونا ہمیں بے چین کر دیتا۔ مجھے تو اس کے رونے میں نہ جانے کیوں ہلکی سی کراہ کا احساس ہوتا۔ اس کی طفلی مسکراہٹ ہماری آنکھیں بھگو دیتی۔

آہ! اس معصوم کو کیا خبر تھی کہ موت کا بے رحم ہاتھ اس پر کیا ستم ڈھا چکا تھا! کس ہستی کو چھین چکا تھا اس سے!

مجھے منجھلی آپا سے غیر معمولی ہمدردی محسوس ہوتی اور یادگار پر بے پناہ ترس آتا۔ بحرِ حیات میں اس ننھی جان کے لیے نہ جانے کتنی گرم و سرد لہریں چھپی تھیں!

○☆○

بعض حادثے زندگی کو بہت منتشر کر دیتے ہیں۔ منجھلی آپا کا بیوہ ہونا بھی ایسا ہی ایک حادثہ تھا۔ اس سانحے نے ہمارے گھر ہی نہیں ہماری زندگیوں کا نقشہ بھی بدل کر رکھ دیا۔ ابو جی تو جیسے ریت کی دیوار کی طرح ڈھے کر رہ گئے۔

امتحانات کے بعد میں بہت باقاعدگی سے ابو جی کے ساتھ فیکٹری تو جانے ہی لگی تھی' دھیرے دھیرے ابو جی کی دوسری بہت سی ذمے داریاں بھی بٹانے لگی۔ وہ ذمے داریاں جو سربراہِ خانہ پر اس کے گھر اور کنبے کے سلسلے میں عائد ہوتی ہیں۔

میں نے گاڑی چلانا سیکھ لی۔ گھر کے سودا سلف کا خیال رکھتی۔ ملازم کو ساتھ لے جا کر گھر کے لیے گوشت' ترکاری' پھل اور دیگر اجناس خریدتی۔ مجھے روز مرہ استعمال کی چیزوں کے تازہ ترین نرخ ازبر رہنے لگے۔ بجلی' گیس اور ٹیلی فون کے بلوں کی ادائیگی کا خیال میں رکھتی۔ امی جان کے پاندان کے لیے پان' چھالیا اور کتھے' چونے کی باقاعدہ فراہمی بھی میں نے اپنے ذمے لے لی۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد جب اچانک پانوں کا کال پڑا تو اس وقت بھی میں نے امی کے پاندان میں پانوں کی کمی نہیں آنے دی اور ایک مرتبہ بھی امی کو امرود کا پتا نہیں چبانے دیا۔ مجھے پورے شہر میں بھی گھومنا پڑتا تو میں امی کے لیے پان پیشگی لا کر رکھتی۔ بعد میں' میں نے گھر ہی میں پان کی بیلیں پھیلوا دیں۔

میں منجھلی آپا کی دل جوئی بھی کرتی اور اکثر یادگار کو اپنے سینے سے لگا کر اسے ٹہلاتی اور کبھی کبھی اسے گود میں لیے لیے گھر سے باہر نکل کر گھر کے سامنے لمبی سڑک پر دور تک نکل جاتی۔

ہم بچوں کو ناسمجھ سمجھتے ہیں لیکن بچے شاید بڑوں سے بھی زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں!

یادگار چند ہی ماہ میں مجھ سے اتنی مانوس ہو گئی کہ مجھے دیکھتے ہی ہاتھ پاؤں چلانے لگتی اور کبھی غوں غاں کرتے ہوئے اور کبھی مسرت آمیز قلقاریوں سے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی۔ میں اسے گود میں لے لیتی اور وہ اس وقت تک میری گود سے منجھلی آپا کے پاس جانے کو راضی نہ ہوتی جب تک میں اسے کچھ دیر تک ٹہلا نہ دیتی۔ منجھلی آپا کے بعد گھر بھر میں وہ سب سے زیادہ مجھی سے مانوس ہوئی تھی۔

مجھے منجھلی آپا اور یادگار کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنا ہوتا۔ بے چاری منجھلی آپا کی ضرورتیں تو برائے نام رہ گئی تھیں۔ یادگار کے لیے دودھ اور دلیے کے ڈبے میں پیشگی لا کر رکھ دیتی۔ آئے دن اس کے لیے ننھے منے' خوش رنگ کپڑے خرید کر لاتی۔ بازار میں جہاں کوئی اچھا کھلونا نظر آتا' میں اس کے لیے خرید لاتی۔ بے بی شیمپو' بے بی لوشن اور پاؤڈر کی کمی نہ ہونے دیتی میں اس کے لیے۔

یادگار کے لیے میں جب بھی کوئی چیز لے کر آتی' منجھلی آپا کی آنکھوں میں سرخی سی پھیل جاتی۔

سسرال والوں نے شوکت بھائی کے انتقال کے بعد منجھلی آپا اور اس بچی سے ایسی غیریت اور بے رخی برتی تھی کہ خدا کی پناہ! اس غیریت اور بے رخی کا سبب غالباً وہ اثاثے تھے جو شوکت بھائی نے نہ جانے کن مصلحتوں کے تحت اپنے بجائے اپنے گھر والوں کے نام رکھے تھے۔ زندگی مہلت دیتی تو کیا عجب کہ وہ اپنی بیوی اور

بچوں کو ان کا حق دار قرار دیتے مگر زندگی نے انہیں مہلت ہی کب دی!

اپنے پرایوں کی رائے یہ تھی کہ مجھلی آپا کو خواہ اپنے لیے نہ سہی بچی کے حق کے لیے سسرال والوں سے مطالبہ کرنا چاہیے تھا مگر مجھلی آپا کہتی تھیں کہ انہیں یادگار کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ ابوجی اور امی جان بھی کسی چپقلش کے حق میں نہ تھے۔

امی جان اور ابوجی دونوں ہی نے شوکت بھائی کی موت کا گہرا صدمہ لیا تھا۔ امی جان مجھلی آپا اور یادگار کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرتیں۔ ابوجی بھی بجھ سے گئے تھے۔

ایک روز فیکٹری میں لنچ بریک کے وقت ابوجی ہاتھ دھو کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو ان کا چہرہ دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں یوں لگا جیسے وہ اچانک ہی بہت بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ میرا دل کٹنے لگا "ابوجی!" میں نے دھیرے سے کہا "آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔"

ابو کے لبوں پر بڑی محزون سی مسکراہٹ پھیل گئی "بڑھاپا ہے بیٹے۔" وہ بولے۔

"آپ نے شوکت بھائی کی موت کا بہت صدمہ لیا ہے۔"

ابو نے ایک سرد آہ کھینچی اور بولے "صدمہ میں نے شوکت کی موت کا نہیں، رابعہ کے بیوہ ہو جانے کا لیا ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں..... ایک ہی بات نہیں ہے۔" ابو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا پھر قدرے توقف سے بولے "اس شہر میں روزانہ نہ جانے کتنے حادثے ہوتے ہیں جن میں شوکت جیسے کڑیل جوان مارے جاتے ہیں۔ شوکت اگر رابعہ کا خاوند نہ ہوتا تو اس کی موت سے ہمیں کیا فرق پڑتا!"

میں نے قدرے حیرانی سے ابوجی کو دیکھا۔ خود غرضی اور ابوجی میرے لیے دو متضاد باتیں تھیں۔ ابوجی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ ایک سرد آہ کھینچ کر بھیگی ہوئی آواز میں بولے "جب تک ہم خود کسی حادثے سے نہیں گزرتے، ہمیں اس حادثے کی شدت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔" ابوجی نے توقف کیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولے "رابعہ کی چیخیں میرے دل سے نکلتی ہی نہیں کسی صورت..... جب میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا، صبر کرو اللہ کی مصلحت وہی جانتا ہے تو اس نے میرا گریبان پکڑ کر کہا، مجھے ایک مرتبہ بتادیں ابوجی کہ شوکت کے مرنے میں اللہ کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے، پھر میں کبھی نہیں روؤں گی۔"

اچانک ابوجی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپالیا اور بچوں کی طرح رونے لگے۔

ابوجی جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں روتے دیکھا تھا گھٹ گھٹ کر رو رہے تھے اور میرا دل پارہ پارہ ہوئے جا رہا تھا۔

بعض حادثے ہمیں کتنا کمزور کر دیتے ہیں!

میں نے ابوجی کو دلاسا دینے کی کوشش کی۔

"سوچا تھا رابعہ کے فرض سے سبک دوش ہو جاؤں گا تو تین بیٹیاں رہ جائیں گی۔" ابوجی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

ابوجی کا حساب کتاب میرے لیے نامانوس نہ تھا۔ میں تو ان کا بیٹا تھی!

"ہاہ!" ابو نے ایک سرد آہ بھری "انسان سوچتا کچھ ہے، ہو کچھ جاتا ہے۔"

ابوجی کی بات پر مجھے رافع یاد آگیا۔ اس نے بھی تو ایک بار یہی کہا تھا۔ قرن تو نہیں بیت گئے تھے۔ کچھ ہی دنوں پہلے کی تو بات تھی جب میں، انیتا اور رافع ایک مثلث کے تین اضلاع کی طرح باہم یک جا تھے مگر اب نہ مجھے ان دونوں کی کچھ خبر تھی نہ شاید انہیں میرا پتا تھا۔

شوکت بھائی کی موت نے کتنی گڑبڑ کردی تھی! مجھے اس لڑکی کو فون کرنے کی فرصت نہ ملی جو کالج میں چار برس تک میری ہمزاد بنی رہی تھی۔ نہ جانے وہ یہیں تھی یا نیوبلی چلی گئی تھی۔ رافع بھی خدا جانے کہاں تھا..... کس حال میں تھا۔

ہنگامہ ہائے زندگی نے مجھے کس بری طرح گھیر لیا تھا!

O☆O

مجھلی آپا کی بیوگی کے بعد گھر والوں کے از سر نو زندگی کی گہما گہمی میں لوٹنے تک میں اپنے گھر اور گھر والوں کی مکمل طور پر اور کل وقتی کیئر ٹیکر بن چکی تھی۔ مجھے مجھلی آپا اور یادگار ہی نہیں گھر کے ہر فرد کی ضرورت اور سہولت کا خیال رکھنا پڑتا۔

فیکٹری جانے سے پہلے مجھے بہت سے کام نمٹانے ہوتے اور شام کو گھر واپسی پر بھی بہت سے کام نمٹاتے ہوئے آتی اور کچھ کی انجام دہی میری گھر واپسی سے مشروط ہوتی۔

کبھی امی جان یاد دلاتیں کہ چائے کی پتی ختم ہونے والی ہے، شام کو گھر لوٹوں تو اپنی مخصوص دکان سے پتی خریدتی ہوئی آؤں۔ کبھی کسی بہن کے کپڑے درزی کے ہاں سے لینے ہوتے۔ کبھی سعدیہ کا شیمپو قریب الختم ہوتا۔ کبھی رعنا کو کوئی کتاب بازار سے درکار ہوتی۔ کبھی عینک ساز کے ہاں سے امی جان کی عینک لینا ہوتی۔ کبھی ابوجی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوتا۔

مجھلی آپا کا دکھ ابوجی نے اپنے دل سے ایسا لگایا تھا کہ آئے دن بیمار رہنے لگے تھے۔

مجھلی آپا اور یادگار کی ہر ضرورت کا میں از خود اتنا خیال رکھتی کہ نہ انہیں کچھ کہنے کی ضرورت ہوتی نہ کسی اور کو مجھے یاد دلانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔

اور میری خود فراموشی کی انتہا یہ تھی کہ اخبار میں اپنا بی کام کا نتیجہ دیکھنے کے بعد میں مارکس شیٹ لینے کے لیے بھی کالج نہیں گئی تھی۔ مجھے مارکس شیٹ لینے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ کون سا مجھے کہیں نوکری کرنی تھی یا آگے پڑھنا تھا۔

رافع اور انیتا کے رول نمبرز میرے پاس لکھے نہ ہوتے تو شاید مجھے یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ دونوں بھی سیکنڈ ڈویژن میں پاس

ہو گئے تھے۔ خدا جانے انجیا کہاں گئی کیا کر رہی تھی۔ رافع نے ایم کام میں داخلہ لیا تھا یا نہیں۔

کیسی بے مہری تھی! میں نے ان کا حال نہ پوچھا تھا۔ انہوں نے میرا حال جاننے کی زحمت نہ کی تھی۔ میں تو خیر مصروف بہت تھی۔ بے مروتی دونوں تھے!

رافع کا خیال آتا تو مجھے اپنے دل میں ایک ہلکی سی کسک محسوس ہوتی پھر میں بھول جاتی۔ شاید اسکول اور کالج کو خیرباد کہنے کے بعد سبھی اپنے ہم جماعتوں کو اسی طرح بھول جاتے ہیں۔

مجھلی آپا کی بیوگی کے سانحے کے باعث بڑی آپا کی شادی قدرے تاخیر سے ہوئی اور امی جان کی ایک دیرینہ شناسا کے توسط سے ہوئی۔

شادی کے جملہ انتظامات میں' مَیں پیش پیش رہی۔ اپنے پرایوں سبھی نے واہ واہ کی۔

"بیٹی ہو تو حبیبہ جیسی!" مجھے یہ جملہ بارہا سننے کو ملا اور اس جملے نے میرا دل بہت بڑھایا۔ میں ایسے مقام پر تخت نشیں ہو گئی جہاں سے آنے والے دنوں میں مجھے خود کو اتارنا انتہائی مشکل ہو گیا!

O☆O

سعدیہ کی بڑے ماموں کے بیٹے سہیل سے ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ بڑی آپا کی شادی کے بعد ماموں جان نے اپنی امانت اپنے گھر لے جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ امی جان اور ابو جی نے مجھ سے صلاح چاہی۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہ رہی تھی۔ امی جان اور ابو جی تمام اہم معاملات میں مجھ سے صلاح مشورہ لینے لگے تھے۔

"جیسے آپ کی مرضی ابو جی" میں نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔

امی اور ابو جی نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر امی بولیں۔

"تمہارے ابو کا خیال ہے ابھی تو تم نے ایک بہن کی شادی نمٹائی ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے امی جان۔"

"فرق یہ پڑتا ہے بیٹے جی کہ ابھی تو تمہاری پہلی تھکن بھی نہیں اتری ہو گی۔" ابو جی نے کہا۔

"آپ میری فکر نہ کریں ابو جی۔"

"سوچ لو بیٹے۔"

"ابو جی' سوچنا کیا ہے..... بہنیں جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائیں' اچھا ہے۔"

"ہوں" ابو جی نے اثبات میں سر ہلایا پھر امی سے بولے "ٹھیک ہے..... اپنے بھائی سے کہو بسم اللہ کریں۔"

سعدیہ کی شادی کی تیاری چھڑ گئی۔ میرا ایک پاؤں فیکٹری میں ہوتا دوسرا گھر یا بازار میں۔ ہر سو مجھے اپنے ہی نام کی پکار سنائی دیتی۔ ایک ساتھ اتنے بہت سے کام نکلے چلے آئے کہ خدا کی پناہ! میں صبح سے رات گئے تک مصروف رہتی۔ کبھی امی یاد دلاتیں کہ جہیز میں فلاں چیز کی کمی تھی۔ کبھی درزی کے ہاں جانا ہوتا۔ غرض ہزاروں کام تھے۔

صبح سے رات تک میں پھرکی کی طرح گھومتی رہتی مگر نہ میرے پاؤں تھکتے نہ ماتھے پر شکن آتی۔ اپنے پرائے میری ہمت کی داد دیتے نہ تھکتے۔ ولیمے میں شرکت کے بعد گھر واپسی پر ابو جی نے امی سے کہا "اب رعنا رہ گئی ہے۔"

"رابعہ کا بھی گھر بسانا ہے پھر سے..... اسے اس طرح تھوڑی چھوڑنا ہے۔" امی بولیں۔ میں خاموشی سے سن رہی تھی۔ امی اور ابو جی دونوں ہی حسب عادت مجھے بھول گئے تھے۔

ان کی اس بھول کا میں نے پہلی مرتبہ پوری سنجیدگی سے نوٹس لیا!

O☆O

سعدیہ کی شادی کے بعد ایک روز مجھلی آپا نے مجھ سے کہا۔

"فیکٹری میں میرے لیے بھی کوئی جگہ ہے؟"

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پوچھا "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ نوکری مل سکتی ہے مجھے؟"

"کیوں بھئی؟ آپ کو نوکری کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟"

"کچھ تو کرنا ہے۔"

"کیوں کرنا ہے؟"

"کیوں کہ زندہ رہنا ہے..... یادگار کے لیے۔" مجھلی آپا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

مجھلی آپا کو دلاسا دینے کے لیے میں ان کے نزدیک بیٹھ گئی اور میں نے ان کے شانوں پر اپنا بازو دراز کرتے ہوئے کہا "آپ کو اپنے لیے بھی زندہ رہنا چاہیے مجھلی آپا۔"

"نہیں..... میں تو..... شوکت کے ساتھ مر چکی ہوں۔" مجھلی آپا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"حوصلہ کیجئے مجھلی آپا..... ابو جی کی خاطر۔"

مجھلی آپا نے بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"ہاں" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "ابو جی کو آپ کے اجڑنے کا بہت صدمہ ہے۔"

مجھلی آپا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

امی اور ابو جی کو پتا چلا کہ مجھلی آپا ملازمت کرنے کا ارادہ کر رہی تھیں تو امی نے ان سے پوچھا "کیا کسی کی کوئی بات بری لگ گئی ہے؟"

"نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں امی جان..... یہاں تو سب اتنا خیال رکھتے ہیں میرا اور یادگار کا کہ....." مجھلی آپا کی آواز رندھ گئی۔

"تو پھر کیا بات ہے؟" ابو جی نے کہا۔

"ابو جی' مجھے اپنے اور یادگار کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔" مجھلی آپا نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا..... کوئی تکلیف ہے تمہیں یہاں؟" ابو جی بولے۔

"نہیں ابو جی' ایسی کوئی بات نہیں..."

"تو پھر؟" ابو جی کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

"آپ لوگوں پر کب تک بوجھ بنی رہوں گی میں..... مجھے اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہیے۔" منجھلی آپا نے کہا۔

"بوجھ!" ابو جی بوجھل آواز میں بولے "یہ تم نے کیسے جانا کہ تم خدا نخواستہ بوجھ ہو ہمارے لیے۔ بیٹیاں بھی کبھی بوجھ ہوتی ہیں۔"

منجھلی آپا پر رقت سی طاری ہو گئی۔ امی نے ان کی طرف دیکھا اور اپنے چہرے پر پلو ڈھانپ کر سسکنے لگیں۔

میں نے ابو جی کی جانب دیکھا۔ وہ انتہائی دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے فضا کو انتہائی افسردہ ہوتے دیکھا تو منجھلی آپا کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا "آپ کچھ نہیں کریں گی، بس آرام سے گھر میں بیٹھی رہیں۔"

منجھلی آپا اس وقت تو چپ رہیں تاہم بعد میں انہوں نے امی اور ابو جی سے علیحدگی میں مجھ سے کہا "اپنے لیے نہ سہی یادگار کے لیے تو مجھے ضرور کچھ کرنا پڑے گا۔"

"یادگار کی فکر کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں آپ کو..... اسے میری ذمے داری سمجھئے۔"

منجھلی آپا نے مشکور نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولیں "کتنا خیال رکھتی ہو تم اس کا!"

"یہ میرا اور یادگار کا معاملہ ہے۔ براہِ کرم آپ دخل اندازی مت فرمائیں۔" میں نے خوش دلی سے کہا "اور ہاں آئندہ نوکری ووکری کی بات مت کیجئے گا آپ امی اور ابو جی کے سامنے۔"

"کیوں؟"

"انہیں آپ کی اس بات سے تکلیف پہنچی ہے۔"

"تو کیا میں ہمیشہ بوجھ بنی رہوں گی۔"

"پلیز!" میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے منجھلی آپا کو چپ رہنے کی تلقین کی۔

O☆O

اگلے دو ڈھائی برس اس طور گزرے کہ رعنا اپنی تعلیم میں معروف رہی۔ منجھلی آپا کے لیے ایک دو رشتے آئے جنہیں انہوں نے پوری شدت سے رد کر دیا۔ یادگار کی معصوم باتوں سے امی اور ابو جی بہت بہلے رہنے لگے۔ فیکٹری اور گھر کا اب تقریباً سارا ہی بار میرے کاندھوں پر تھا۔

رعنا ہاؤس جاب کر رہی تھی کہ اس کے لیے شگفتہ کے توسط سے امریکا میں مقیم ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا۔ لڑکا اور اس کی والدہ اور دو بڑے بھائی وہیں مقیم تھے۔ سعدیہ کی شادی کی موی میں انہیں رعنا بہت پسند آئی تھی اور انہوں نے پیغام بھجوایا تھا۔ شگفتہ اور کاشف نے لڑکے اور اس کے گھر والوں کی طرف سے پورا اطمینان دلایا۔ گھر میں سب صلاح مشورے کے لیے بیٹھے۔ ابو جی نے مجھ سے میری صلاح پوچھی۔ میں نے کہا "پہلے رعنا کی مرضی معلوم کریں۔"

رعنا سے پوچھا گیا تو اس نے کہا "جب تک منجھلی آپا کی شادی نہیں ہوتی، میں شادی نہیں کروں گی۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" منجھلی آپا نے اس سے کہا۔

"بس یہ میرا فیصلہ ہے۔" رعنا بھی اڑ گئی۔

امی نے مجھ سے کہا "رشتہ اچھا ہے، تم رعنا کو سمجھاؤ۔"

"ہاں تم سمجھاؤ، تمہاری بات مان لے گی وہ۔" منجھلی آپا نے بھی تائید کی۔

"آپ بھی ہم سب کی بات کیوں نہیں مان لیتیں؟" میں نے منجھلی آپا سے کہا۔

"اس وقت تو رعنا کی بات ہو رہی ہے۔"

"آپ کی بھی تو دو مرتبہ ہو چکی ہے۔ آپ نے میری بات مانی تھی جو وہ مان لے گی۔"

"پلیز اسے سمجھاؤ ورنہ....."

"ورنہ؟"

"مجھے یہ احساس رہے گا کہ میری وجہ سے رعنا کے لیے ایک اچھا رشتہ جاتا رہا۔"

"میں صرف ایک شرط پر سمجھا سکتی ہوں اسے۔"

"وہ کیا؟"

"کہ آپ بھی ہم سب کی بات مان لیں گی۔"

"میری بات چھوڑو۔"

"تو پھر رعنا کی بات بھی چھوڑیں۔"

"اتنی سمجھ دار ہو کر تم بھی بچوں کی سی باتیں کرنے لگیں۔"

"اچھا بس اب کوئی بات نہیں کروں گی میں، نہ آپ سے نہ رعنا سے۔"

کئی روز گھر میں یہ مسئلہ چھڑا رہا۔ بالآخر منجھلی آپا نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں ہاری..... رعنا ہاں کر دے تو میں بھی سب کی بات مان لوں گی۔"

امی نے تاسف سے کہا "کاش! یہ ساری بات پہلے ہو گئی ہوتی تو رابعہ کے لیے دو رشتے تو نہ نکلتے۔"

ابو جی نے کہا "کوئی بات نہیں پھر سہی۔"

رعنا نے کہا "پہلے منجھلی آپا کی شادی ہو پھر میں کروں گی۔"

میں نے رعنا کو سمجھایا کہ منجھلی آپا کے انتظار میں اس کے لیے تو شیراز کے گھر والے ہو سکتا ہے انتظار نہ کریں۔

"نہ کریں۔" اس نے سرفروشانہ انداز میں کہا۔

میں نے کہا "منجھلی آپا کا راضی ہونا مسئلہ تھا اب وہ راضی ہو گئی ہیں۔ ان کی شادی کروانا اب میرا کام ہے۔ تم اب مزید ضد مت کرو۔"

رعنا نے کہا "منجھلی آپا نے میری ضد کے سامنے رضامندی تو ظاہر کر دی ہے بعد میں وہ انکار بھی کر سکتی ہیں۔ پہلے آپ لوگ انہی کی شادی کریں۔"

میں نے رعنا سے کہا "تم فکر مت کرو..... منجھلی آپا کی

"شادی کروانا اب میرا کام ہے بلکہ میری ذمے داری۔"
رعنا بمشکل راضی ہوئی۔

ابوجی کی چوتھی بیٹی بھی اپنے گھر کی ہوگئی۔ اب بس مجھلی آپا رہ گئی تھیں!

میں تو ابوجی کا بیٹا تھی۔

○☆○

رعنا کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ اس کی شادی کے کچھ عرصے بعد جب مجھلی آپا کے لیے ایک رشتہ آیا تو وہ اپنے وعدے سے صاف مکر گئیں۔

مجھلی آپا کے لیے اس بار یہ رشتہ بڑی آپا کی نند کے توسط سے آیا تھا۔ صاحب دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ دو بچے تھے ایک لڑکا ایک لڑکی۔ بیوی سینے کے سرطان میں مبتلا ہو کر انتقال کر چکی تھیں۔

مجھلی آپا نے حسب سابق انکار کیا تو میں نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔

"تم لوگ مجھے مجبور کیوں کرتے ہو!" مجھلی آپا کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

"کیوں کہ ہمیں آپ کی فکر ہے۔"

"اسی لیے۔۔۔ اسی لیے تو میں نوکری کرنا چاہتی تھی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا!"

"اس سے یہ فرق پڑتا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی۔۔۔ اپنا بوجھ آپ اٹھاتی اور۔۔۔ اور تم لوگوں کو میری فکر نہ رہتی۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔" میں نے کہا "ہم آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"خوش! مجھے!" مجھلی آپا تلخی سے مسکرادیں پھر بولیں "خوشی میرے مقدر میں ہوتی تو شوکت۔۔۔" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔

"مجھلی آپا! خوشی کسی فرد واحد سے تو مشروط نہیں ہوتی۔"

"تم۔۔۔ تم نہیں جانتیں حبیبہ!" مجھلی آپا نے کہا "کبھی کبھی ہمارا جینا مرنا ہی فرد واحد سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ شوکت تھے تو میں جیتی تھی اب تو ایک چلتی پھرتی لاش ہوں میں۔۔۔ یادگار نہ ہوتی تو میں کب کی زندگی کی قید سے آزاد کر چکی ہوتی خود کو۔"

"آپا! امی کی خاطر۔۔۔ ابوجی کی خاطر۔۔۔ آپ ہم سب کی یہ بات مان کر تو دیکھیں۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"میں۔۔۔ میں یادگار کو کسی اور کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑوں گی۔" مجھلی آپا بولیں۔

"یادگار کو آپ۔۔۔ آپ ہمارے پاس ہی چھوڑ دیجئے گا۔۔۔۔ امی جان، ابوجی اور میں، ہم تینوں اسے اپنے دل سے لگا کر رکھیں گے۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں حبیبہ!" مجھلی آپا تڑپ کر بولیں۔

"وہ ہمارے پاس بہت آرام سے رہے گی آپا۔" میں نے انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

"مگر میں تو اس کے بغیر چین سے نہیں رہ سکوں گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے، آپ اسے ساتھ ہی رکھیے گا مگر للہ اپنا وعدہ تو نہ بھولیں۔"

"آئی ایم سوری۔" مجھلی آپا نے مجھے کورا جواب دے دیا۔

مگر اس مرتبہ امی اور ابوجی نے مجھلی آپا سے نہ جانے کیا کہا سنا کہ بالآخر انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔

مجھلی آپا کا نکاح بہت سادگی سے ہوا۔ امی اور ابوجی اپنی آخری بیٹی کے فرض سے دوبارہ سبکدوش ہوگئے۔

یادگار مجھلی آپا کے ساتھ چلی گئی۔ اس رات یادگار کے جانے کے بعد میں پوری رات اسی طرح گھٹ گھٹ کر روتی رہی جیسے کبھی شگفتہ کی رخصتی کے بعد روئی تھی۔

یادگار کے جانے سے ہمارا گھر سناٹوں میں ڈوب گیا!

○☆○

ابوجی نے بہت بے ایمانی دکھائی! میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنے خود غرض ہوں گے۔

ہاں یہ خود غرضی ہی تو تھی!

مجھلی آپا کی شادی کے کچھ ہی دنوں بعد ایک روز ابوجی حسب معمول فیکٹری سے میرے ساتھ گھر لوٹے تو انہوں نے امی سے کہا۔

"آج نہ جانے کیوں دن بھر یادگار یاد آتی رہی مجھے۔"

"ملنے چلے گئے ہوتے۔" امی نے کہا۔

"پرسوں ہی تو گیا تھا۔۔۔ بیٹیوں کے ہاں روز روز جانا اچھا نہیں لگتا۔"

"ارے آپ کون سا کوئی بار ڈالتے ہیں بیٹی پر۔۔۔ یادگار کی ہڑک میں جاتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ مگر آج تہیہ کر لیا کہ اب تک گیا سو گیا اب وہاں زیادہ نہیں جاؤں گا۔ محبت ہو یا نفرت، اپنے قابو میں ہونی چاہیے ورنہ خود کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے کو بھی۔"

"ابوجی! آپ نے مجھ سے ذکر کیا ہوتا کہ یادگار یاد آرہی ہے تو ہم واپسی پر اسے ساتھ لیتے آتے۔" یادگار سے مجھے خود بھی بہت انس تھا اور کبھی کبھی میں اسے ساتھ لے آتی تھی۔

میری بات پر ابوجی نے کہا "دل کو جدائی کا عادی بھی ہونا چاہیے بیٹے۔"

مجھے کیا خبر تھی کہ ابوجی کس قسم کی جدائی کی بات کر رہے تھے۔

مغرب کی نماز کے بعد ابوجی نے مجھ سے کہا "بیٹے! میں دیکھتا ہوں یادگار کے ساتھ اس کے باپ اور اس کے بچوں کا رویہ اچھا نہیں ہے۔ جب تک یادگار بڑی نہیں ہو جاتی، تمہیں اس کا خیال رکھنا ہوگا۔"

"مجھے خود بھی اس بات کا احساس ہے ابوجی۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد ابوجی امی سے یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے

گئے کہ وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتے تھے' عشا کے وقت انہیں جگا دیا جائے۔
ابوجی کے لیٹ جانے کے بعد میں نے امی سے کہا "میں یادگار کو لینے جا رہی ہوں۔"
"اس وقت!"
"جی۔"
"کیوں؟"
"کیوں کہ ابوجی آج اس کی یاد میں بہت اداس ہو رہے ہیں۔"
"بیٹا' کل لے آنا۔"
"صبح کو تو وہ اسکول چلی جائے گی۔"
"ارے تو کیا ہوا' دوپہر کو یا شام کو لے آنا۔"
"نہیں امی جی' میں اسے ابھی لینے جا رہی ہوں۔"
"اچھا... جیسے تمہاری مرضی۔"
میں یادگار کو لے کر واپس لوٹی تو عشا کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔
میں نے یادگار سے کہا "نانا جی کے کمرے میں جا کر آہستہ سے انہیں پپی کرو اور کہو میں آگئی ہوں نانا جی۔"
یادگار ابوجی کے کمرے میں گئی۔ میں نیم وا دروازے کی اوٹ میں کھڑی مسکراتی رہی۔ میرا خیال تھا' ابوجی یادگار کی آواز سنتے ہی اٹھ بیٹھیں گے اور اسے اپنے سینے سے لگا کر پوچھیں گے "ساتھ کون کون آیا ہے نانا کی جان؟"
مگر ایسا نہیں ہوا۔ یادگار ابوجی کو پیار پہ پیار کیے گئی۔ انہیں پکارتی رہی۔ بتاتی رہی "نانا جی' میں آگئی۔" مگر نانا جی نہیں جاگے۔
وہ ابدی نیند سو چکے تھے!
ابوجی کی موت نے مجھے شدید صدمہ پہنچایا۔ مجھے یوں لگتا جیسے میں اپنے باپ ہی نہیں' ایک دوست اور ہم راز سے محروم ہو گئی تھی۔ کتنی بہت سی چھوٹی بڑی باتیں تھیں جن میں ان کا اور میرا ساجھا تھا۔ کتنے مسائل تھے جو ہم بٹاتے تھے۔ خانگی اور کاروباری مسائل میں اب کوئی میرا شریک اور مشیر نہ رہا تھا۔
میں پہلے ہی کچھ کم اکیلی تھی جو ابوجی مجھے مزید تنہا کر گئے!

○☆○

ابوجی کی موت کے بعد کچھ دن تو سبھی اداس رہے۔ گھر میں ہر وقت کا آنا جانا لگا رہا۔
ابوجی مجھے جس خلعتِ فاخرہ سے آراستہ کر کے' میرے سینے پر ایک نشانِ امتیاز لگا کر سالارِ قافلہ بنا گئے تھے اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی مجھے اس موقع پر! اس وقت بھی جب امی اور میری بہنیں ابوجی کی میت پر سر جوڑے گریہ کناں تھیں' میں ابوجی کی تجہیز و تکفین اور تدفین کے مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ انہیں کون سے قبرستان میں دفن کیا جائے گا' زمین کتنی لی جائے گی؟ شگفتہ اور رعنا کس وقت تک پہنچیں گی؟ نمازِ جنازہ کس وقت ہو گی؟ بہتی کس کس سے لی جائے گی؟
مجھے امی کے آنسو بھی پونچھنا تھے۔ بہنوں کو بھی دلاسا دینا تھا۔
میں ابوجی کا بیٹا جو تھی!
میں اگر یہ کہوں کہ مجھے ابوجی کے سرہانے بیٹھ کر رونے کا بھی وقت نہیں مل سکا تھا تو بے جا نہ ہو گا۔
چند دن گریہ کناں رہ کر میری پانچوں بہنیں ہنگامہ ہائے روز و شب کی طرف پلٹ گئیں کہ ان میں سے ہر ایک کا اپنا گھر تھا' شوہر تھا' بچے تھے' ذمے داریاں تھیں اور اپنی اپنی زندگی کے جھمیلے۔
سب کے جانے کے بعد امی کے آنسو میں نے اپنی جھولی میں سمیٹے۔
مجھے گھر کا خیال بھی رکھنا پڑتا' کاروبار بھی سنبھالنا ہوتا اور امی جان کو دلاسا بھی دینا پڑتا۔ ابوجی کے چہلم کے بعد بڑی آپا کے میاں نے دبی زبان سے ابوجی کے ترکے کی تقسیم کا قصہ چھیڑ دیا۔
شگفتہ اور رعنا نے اپنے اپنے حصے سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔
مگر بڑی آپا' منجھلی آپا اور سعدیہ اپنے شوہروں کی مرضی نہ پاتے ہوئے یہ جرأت نہ کر سکیں۔
امی جان نے کہا "فیکٹری رہے یا نہ رہے' گھر کے حصے بخرے نہیں ہونے دوں گی میں۔"
کسی بدمزگی یا رنجش سے بچنے کی خاطر میں نے فیکٹری فروخت کر دی اور حاصل ہونے والی رقم میں سے بہنوں کو گھر کا حصہ بھی فرداً فرداً چکا دیا۔
گھر کو حصے داروں سے آزاد کرا کے میں نے بالائی منزل کرائے پر اٹھا دی اور فیکٹری کی فروخت کے بعد بہنوں کو حصے دینے کے بعد جو رقم بچی وہ میں نے ایک سرکاری ادارے میں منافع پر لگا دی۔
ابوجی کی موت کے بعد منجھلی آپا نے یادگار کو امی کا دل بہلے رہنے کی خاطر کافی دنوں تک ہمارے پاس ہی چھوڑے رکھا۔ میں اسے اسکول پہنچاتی اور چھٹی کے وقت لے آتی۔ اس کے رہنے سے امی جان کا دل واقعی بہلا رہتا۔

○☆○

اگرچہ مجھے اور امی جان کو معاشی تنگی کا قطعاً خدشہ نہ تھا۔ فیکٹری فروخت کر دینے کے باوجود ہمارے ذرائع آمدن خاصے اطمینان بخش تھے۔ امی جان اور میں نہ صرف خوش حال زندگی بسر کر سکتے تھے بلکہ گھر کی دیکھ بھال اور کام کاج پر مامور ملازم کی ادائیگی کے علاوہ یادگار کی ہر ضرورت بھی بخوبی پوری کی جا سکتی تھی مگر اس طمانیت کے باوجود میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔
میں پڑھی لکھی تھی۔ فیکٹری چلانے کا تجربہ رکھتی تھی۔ عضوِ معطل بن کر کیوں رہتی۔
کچھ ہی دنوں میں مجھے مشروبات تیار کرنے والے ایک ادارے میں ملازمت مل گئی۔ کبھی خود ایک فیکٹری کی مالک و مختار

ہونا اور دوسروں سے کام لینا اور پھر کسی کی ماتحتی میں ملازمت کرنا دو متضاد باتیں تھیں مگر مجھے زندگی کے اس تضاد سے مفاہمت کرنا پڑی۔

مفاہمت ہی میں عافیت تھی ورنہ زندگی تو ظالم اور جابر ہے۔ کوڑے برساتی ہے اور رونے نہیں دیتی۔ اس کے جبر کے آگے سر نہ جھکاؤ تو جلاد کی طرح ٹوکا نکال کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

میں نے چپ چاپ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ زندگی حکم دینے ہی نہیں' حکم بجالانے کا نام بھی ہے۔

تاہم زندگی کے اس تلخ تضاد کو قبول کر لینے کے باوجود جب پہلی تنخواہ میرے ہاتھ میں آئی تو میرا دل بھر آیا۔

آہ! دینے والا ہاتھ لینے والا ہاتھ بن گیا تھا!

یادگار اب مستقل طور پر ہمارے پاس آچکی تھی۔ مجھلی آپا کے ہاں ایک بیٹا ہو چکا تھا اور وہ اپنے بیٹے اور اپنے میاں کے دو بچوں میں اتنی مصروف رہتیں کہ یادگار پر خاطر خواہ توجہ دینے کی فرصت ہی نہ رہی تھی ان کے پاس۔ اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ جب وہ خود آتیں ہمارے ہاں یا میں یادگار کو ان سے ملوانے کے لیے لے جاتی تو ان کے میاں کے بچے اس بے چاری کو ایسے ٹھونگیں مارنے لگتے کہ وہ گھبرا کر میرے پاس آچھپنے پر مجبور ہو جاتی۔

میں مجھلی آپا سے ان کے سوتیلے بچوں کی زیادتی کا شکوہ کرتی تو ان کے لبوں پر بڑی مجبور اور محزون سی مسکراہٹ پھیل جاتی۔

ایک روز وہ اسی کیفیت میں بولیں "اسی لیے تو میں دوبارہ شادی کے لیے ہامی نہیں بھرتی تھی۔" مجھے وہ بہت دل گرفتہ دکھائی دیں۔

"اب دو ہی راستے ہیں میرے پاس..... یا تو اس گھر میں یادگار کا وجود' اس کی حیثیت تسلیم کروانے کے لیے ان بچوں کو ماروں پیٹوں' دباؤں اور ان کے ڈیڈی سے لڑوں جھگڑوں یا..... یا پھر یادگار کو نظر انداز کروں۔" مجھلی آپا کی آواز بتدریج رندھتی چلی گئی۔ اپنی بات کے اختتام تک ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔

میرا دل دکھنے لگا۔ مجھلی آپا کتنی مجبور اور متاسف دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی دل جوئی کے لیے میں نے کہا "یادگار کے لیے آپ اپنا دل بالکل چھوٹا مت کیا کریں۔ وہ میرا بچہ ہے۔"

"ہاں۔" آپا بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرادیں "لگتا تو یہی ہے مگر....."

"مگر؟"

"تم بھی کب تک خیال رکھو گی اس کا.... آخر تمہیں بھی تو اپنے گھر جانا ہے۔"

"کہیں نہیں جانا ہے مجھے.... میں ہمیشہ امی کے پاس رہوں گی۔" میں نے کہا۔

"ہاں.... بہتر تو یہی ہے کہ تم امی جان کے پاس ہی رہو۔" میں نے بے ساختہ چونک کر مجھلی آپا کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"جس سے بھی شادی کرو' اس کے سامنے یہی شرط رکھنا کہ گھر داماد رہنا پڑے گا۔ ویسے ابو جی بھی یہی کہا کرتے تھے کہ حبیبہ کی شادی اس سے کریں گے جو گھر داماد رہے۔"

میں نے خاموش رہنے پر اکتفا کیا۔ دل میں چپکے سے ایک شخص کا خیال آیا..... رافع!

میں تو زندگی کی بھول بھلیوں میں اتنی الجھ کر رہ گئی تھی کہ نکلنے کا راستہ ہی نہ مل رہا تھا۔ اس پر ایسی کیا افتاد پڑ گئی تھی کہ اس نے کبھی بھولے سے بھی میرا حال چال تک نہیں پوچھا تھا! اور کچھ نہیں تو ایک دوست' ایک ہم مکتب ہونے کے ناتے ہی کبھی تو اس نے یہ جاننے کی کوشش کی ہوتی کہ میں زندہ تھی یا.....!

دوستوں اور ہم مکتبوں کو اتنا ابن الوقت بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جب تک ساتھ رہیں اور ملتے رہیں' یاد رکھیں اور جوں ہی راستے جدا ہوں بھلادیں!

شاید! شاید اس نے شادی کر لی ہو۔ شاید کیوں؟ یہ بات یقینی بھی تو ہو سکتی تھی۔ کتنے سال ہو گئے تھے مجھے کالج چھوڑے۔ میرا دل مرغ بسمل کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

O☆O

امی جان کو ان دنوں میری بہت فکر لگی ہوئی تھی۔ میری شادی کی فکر!

مجھے شادی سے انکار نہ تھا مگر ابو جی نے اپنی زندگی کا چراغ گل ہونے سے پہلے جو ذمے داری مجھے سونپی تھی وہ مجھے دوسری ہر بات سے زیادہ عزیز تھی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں یادگار کے بڑے ہونے تک شادی نہیں کروں گی۔

"یادگار کے بڑے ہونے تک کون انتظار کرے گا تمہارا!" امی نے کہا۔

نہ کرے۔ اب بھی کون کر رہا تھا!

مجھلی آپا نے کہا "یادگار کی فکر مت کرو۔ اسے جیسے تیسے میں اپنے ساتھ رکھ لوں گی۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے کہا "آپ کے میاں اور ان کے بچے اس بے چاری کا ناطقہ بند کر دیں گے۔"

"تمہیں یادگار کی اتنی ہی فکر ہے تو تم شادی کے بعد اسے اپنے پاس ہی رکھنا۔" بڑی آپا نے کہا۔

مگر میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ کیا عجب کہ جس سے میری شادی ہوتی' یادگار اس کی آنکھوں میں بھی مجھلی آپا کے میاں اور ان کے بچوں کی طرح کھٹکنے لگتی۔

امی جان اور بہنوں نے مجھے بہت سمجھایا مگر میں راضی نہ ہوئی۔ امی جان نے ڈرایا "تمہاری شادی میں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ یہ وقت بھی نکل گیا تو کوئی پلٹ کر پوچھے گا بھی نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"پچھتاؤ گی۔"

"کسی اور کو دوش نہیں دوں گی۔"

مجھے مجبور کرنے کے لیے سعدیہ نے پورا زور لگا دیکھا۔ امریکا سے شگفتہ اور رعنا کے فون آتے مگر میں اپنے فیصلے پر اڑی رہی۔

ایک روز منجھلی آپا نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ مجھ سے کہا۔ "امی تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان کی پریشانی کی ذمے دار میں ہوں۔۔۔۔ نہ میں دوبارہ شادی کرتی' نہ یادگار تمہارے لیے پرابلم بنتی۔"

"پلیز!" میں نے گڑگڑا کر کہا "آپ کو یہ غلط فہمی کیسے ہوئی کہ وہ میرے لیے خدانخواستہ پرابلم بن گئی ہے۔"

"تو پھر انکار کیوں کرتی ہو شادی سے!"

"میں نے انکار تو نہیں کیا' مہلت چاہی ہے۔ جب مناسب سمجھوں گی' شادی کرلوں گی۔"

لیکن جب میں نے شادی کرنا مناسب جانا تو خاندان بھر میں میرے جوڑ کا کوئی باقی نہ بچا تھا۔ ملنے جلنے والوں میں بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ امی جان کے کہنے سننے اور بہنوں کی کوششوں سے دو چار رشتے آئے مگر کہیں بات نہ بنی۔

امی جان کی ایک دیرینہ ملنے والی کے توسط سے ایک کنوارے قانون دان کا رشتہ آیا۔ موصوف کی چال اور کھال انہیں ساٹھا ظاہر کرتی تھی مگر انہوں نے اپنے ڈائی کیے ہوئے بالوں کے زعم میں خود کو چوالیس کا بتایا۔ مجھے بڑی آپا اور منجھلی آپا کے اصرار پر موصوف کا لڑکی سے خود بات کرنے کا شوق پورا کرنے کے لیے ان کے سامنے بیٹھنے اور بات کرنے پر مجبور ہونا پڑا مگر مجھے نہ ان کی شخصیت اچھی لگی نہ گفتگو۔ ان کے جانے کے بعد منجھلی آپا نے مجھ سے پوچھا "کیسے لگے؟"

"زہر!" میں نے بلا تامل کہا۔

"کیوں؟" منجھلی آپا چونک کر بولیں۔

"سارا وقت بکری کی طرح میں میں کرتے رہے اور جھوٹے بھی ہیں۔"

"جھوٹے!؟"

"جی ہاں۔۔۔ ہیئر ڈائی کر کر کے چندیا گنجی ہو چکی ہے اور چوالیس سال عمر بتا رہے تھے ابھی۔"

"چندیا اس لیے گنجی ہے کہ پیسہ بہت ہے۔۔۔ بچ بہت خوش رہو گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

خدا جانے لوگ خوشی کو پیسے سے کیوں مشروط کر دیتے ہیں!

"آپ انہیں منع کر دیں۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

بڑی آپا کے میاں کے ایک دوست کے برادرِ نسبتی کا رشتہ بھی یاد آتا ہے مجھے۔ موصوف پچاس سے تو کسی صورت کم نہ تھے۔ تقریباً بیس سال سے یورپ میں مقیم تھے۔ یورپین بیوی کی چھٹی کر کے مشرقی بیوی کی طلب گاری میں پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ وہ بردکھوے کو آئے تو سعدیہ کے میاں سہیل نے ان کی گاڑی کی عقبی نشست پر وہسکی کی خالی بوتل دیکھ لی اور ان کے جانے کے بعد خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں وہ شوق تو نہیں کرتے۔ سہیل کی اس بات پر بڑی آپا کے میاں بولے "ارے بھئی' اگر شوق کرتے بھی ہوں تو ایسی کون سی بات! اکثر بڑے لوگ شوق کرتے ہیں۔"

"شراب پینے والا آدمی چاہے کتنا ہی بڑا ہو' مجھے ایسے آدمی سے شادی نہیں کرنی۔" میں نے کہا۔

بڑی آپا کے میاں کو میری بات بری لگی "ایک آدمی میں ساری خوبیاں تو نہیں ملتیں۔ کچھ نہ کچھ کی تو برداشت کرنا ہی پڑتی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"شراب پینے والے آدمی سے شادی کرنا تو درکنار' میں اس سے بات بھی نہیں کر سکتی۔"

"بات تو خیر تم نے کرلی۔" فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ طنزاً کہا گیا۔

"کیوں کہ مجھے پتا نہیں تھا۔۔۔۔۔ ورنہ شاید میں اپنے گھر کے گلاس میں کولڈ ڈرنک تو دور کی بات' سادہ پانی بھی نہ پلاتی اس شخص کو۔"

"لگتا ہے یہ تو اب گھر کے سارے گلاس اس ڈر سے توڑ دیں گی کہ خدا جانے کون سا گلاس تھا وہ جس میں۔۔۔۔" منجھلی آپا کے میاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاید توڑ ہی دوں۔" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

بڑی آپا کے میاں کو جن کے توسط سے یہ رشتہ آیا تھا' میری باتیں اس قدر ناگوار گزریں کہ میں نے سنا انہوں نے آئندہ میری شادی کے لیے کوئی کوشش کرنے سے ہاتھ اٹھا لینے کا اعلان کر دیا۔ منجھلی آپا کے میاں نے بھی ان کے اعلان کی تائید کی اور ہاں میں ہاں ملائی۔

امی کہا کرتی تھیں "اپنا پھر اپنا ہوتا ہے۔"

اس بات کا مفہوم پہلی مرتبہ اس قدر وضاحت سے مجھ پر کھلا۔ سہیل اپنا تھا نا اس لیے اس نے آنے والے کے عیب کی نشان دہی کی۔

بڑی آپا اور منجھلی آپا کے شوہروں نے غیر ہونے کا ثبوت دیا!

○☆○

یادگار کالج میں تھی۔

خوش قامتی اسے ماں اور باپ دونوں کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ میری ملازمت جاری تھی اور میں فیکٹری کی منیجر اکاؤنٹس کے عہدے پر کام کر رہی تھی۔ وقت نے مجھے تنگیٔ وقت کا شاکی کر دیا تھا۔ ملازمت کے بعد جو وقت بچتا' اس میں مجھے بہنوں' بہنوئیوں اور ان کے بچوں کی آمدورفت اور خاطر مدارات گھیرے رکھتی۔ میرے بھانجے' بھانجیاں مجھ سے پیار کرتے' مجھ پر بھروسا کرتے اور فرمائشیں کرتے۔

امی جان اکثر مجھے میری غلطی کا احساس دلاتیں اور کہتیں۔ "شادی کرلیتیں تو تمہارے اپنے بھی بچے ہوتے۔"

"یہ بھی تو میرے ہی بچے ہیں۔" میں اپنی بہنوں کے بچوں کی بابت کہتی۔ امی ٹھنڈی سانسیں بھرتیں۔ میں ان کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتی۔

ایک روز میں نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا "امی جان! آپ اداس کیوں ہوتی ہیں۔ میں نقصان میں تو نہیں رہی۔"

امی مجھے الجھی الجھی نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ میں نے ان کی نگاہوں میں ہلکورے لیتا سوال پڑھ لیا۔ وہ یقیناً یہی پوچھنا چاہتی تھیں مجھ سے کہ میں نقصان میں بھلا کیسے نہیں تھی!

"یادگار مجھے اتنا پیار کرتی ہے جتنا شاید وہ منجھلی آپا کو بھی نہیں کرتی۔" میں نے مبالغہ آرائی نہیں کی تھی۔ حقیقت واقعی وہی تھی جو میں نے بیان کی تھی۔ یادگار مجھے اپنی امی سے بھی زیادہ چاہتی تھی۔ میری ذرا سی تکلیف پر وہ مضطرب ہو جاتی۔ میرے آرام اور سہولت کا خیال رکھتی۔ میں دفتر سے گھر لوٹتی تو اسے اپنا منتظر پاتی۔ کبھی واپسی میں دیر ہو جاتی تو وہ مجھے گیٹ پر کھڑی ملتی۔ کبھی کسی وجہ سے دیر تک دفتر میں رکنا پڑتا تو میں باقاعدہ مطلع کرتی اور وہ ہر تھوڑی دیر بعد فون کر کے پوچھتی "کب آئیں گی؟"

ایک روز راستے میں گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے میں کچھ زیادہ ہی تاخیر سے گھر پہنچی تو اس نے رو رو کر آنکھیں سرخ کر رکھی تھیں اور جانے کہاں کہاں فون کر کے اوروں کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ منجھلی آپا تو گھر پہنچی ہوئی تھیں۔

"فون تو کر دیا ہوتا تم نے' اس لڑکی نے تو رو رو کر حال برا کر لیا اپنا۔" امی بولیں۔

"ارے امی جان! فون کرنے کا ہوش تھا نہ جگہ...... راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ ٹیکسی کر کے مکینک کے پاس گئی اور اسے لے کر آئی۔ وہ بے چارہ دیر تک لگا رہا تب جا کر محترمہ اسٹارٹ ہوئیں۔"

"بہرحال آئندہ جب کبھی بھی ایسا موقع ہو تو فون کرنا یاد رکھنا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر یادگار کے سامنے کرتے ہوئے کہا "سوری میم۔"

اس نے ایک کہا نہ دو' میرے شانے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

"اوکے..... اوکے جان' اب غلطی نہیں ہوگی۔"

منجھلی آپا اور امی کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

یادگار کے آنسو تھمے تو اس نے میرے شانے پر سے اپنا سر ہٹایا اور مجھے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "اب اگر کبھی آپ بغیر بتائے یہاں وہاں رکیں نا تو......"

"تو؟" میں نے محبت سے پوچھا۔

وہ مجھے کچھ دیر ٹکٹکی باندھے شاکی نظروں سے دیکھتی رہی پھر یک بیک کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔

اس کی بھیگی آنکھوں اور بے اختیار قلقاری میں تضاد کے باوجود ایک عجیب سی ہم آہنگی محسوس ہوئی مجھے۔ اس کے آنسو اور ہنسی دونوں میرے لیے تھے!

دفتر سے میری واپسی کے بعد وہ میرے لیے چائے بناتی۔ میرے کھانے پینے کا خیال رکھتی۔ میرے کپڑوں کا دھیان رکھتی۔ صبح دفتر جانے کے لیے مجھے استری شدہ کپڑے ہینگر پر وارڈ روب میں لٹکے ملتے۔ اسے میری ضرورت کی چیزوں کا پورا خیال رہتا۔ میری بیش تر شاپنگ اب وہی کرتی تھی۔

مجھ سے اسے اتنا پیار تھا کہ علیحدہ کمرا ہونے کے باوجود رات کو وہ میرے پاس ہی سوتی۔ اس کی دوستوں سے ملاقات ہوتی تو وہ مجھے بتاتیں "آنٹی! یادگار فارغ وقت میں بس آپ ہی کی باتیں کرتی رہتی ہے۔"

میں بھی تو اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کی ہر ضرورت بنا کہے پورا کرتی۔ اس سے میری محبت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا کہ صرف اس کی خاطر میں نے اپنی زندگی کے ان برسوں میں اپنے لیے کچھ نہیں سوچا تھا جو میری پوری زندگی کا عنوان بدل سکتے تھے!

صرف اس کی خاطر!

احباب و اقارب حیران ہوتے کہ زندگی کے سفر میں تنہا رہنے والے بیش تر لوگوں کی طرح میں قنوطی کیوں نہ ہو گئی تھی! شادی نہ ہونے کے باوجود اتنی مطمئن کیوں نظر آتی تھی!

صرف اس لیے کہ مجھے اپنے اس اقدام پر جو میں نے یادگار کی خاطر اٹھایا تھا' قطعاً پچھتاوا نہیں تھا۔ جب فیصلہ آپ کا اپنا ہو تو ملال کیسا! شاید اسی طمانیت کا نتیجہ تھا کہ میں نے اپنے اندر ہی نہیں' باہر بھی قنوطیت اور یاسیت کو طاری نہیں ہونے دیا تھا بلکہ جوں جوں میری عمر بڑھتی جا رہی تھی' میں اپنی ظاہری وضع قطع کا زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔

پہلے مجھے اچھے کپڑوں کا شاید اتنا شوق نہیں تھا جتنا اب ہو گیا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ نوجوانی میں مجھے شوخ رنگ برے لگتے تھے مگر اب میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے لیے شوخ رنگ ملبوسات ہی کا انتخاب کرتی۔

کبھی بالوں کی اگلی لٹوں میں جھلکتے اِکّا دُکّا سفید بال مجھے عزیز ہوا کرتے تھے اور میں اپنے بال آراستہ کرتے ہوئے انہیں نمایاں رکھنے کی کوشش کرتی تھی بعد میں جب سفید بالوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو میں نے بالوں کو مہندی لگانا شروع کر دی تھی لیکن اب میں اپنے بالوں کو اس قدر باقاعدگی سے ہیئر ڈائی سے رنگتی کہ خود مجھے بھی معلوم نہ رہا تھا کہ میرے بالوں میں کتنی سفیدی اتر چکی تھی!

میں اخبارات و رسائل میں "بیوٹی کیئر" سے متعلق مضامین بطور خاص بغور پڑھتی۔

چھٹی والے دن فیشل لیتی' ماسک لگاتی اور چہرے پر بدیسی مصنوعاتِ حسن استعمال کرتی۔ مینی کیور اور پیڈی کیور کا خیال

رکھتی۔
وہ کئی آئینہ لے کر میں ٹیرس میں بیٹھ جاتی اور قدرتی روشنی میں ہر ہر زاویے سے اپنے چہرے کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی اور بالوں کو الٹ پلٹ کر بغور دیکھتی کہ کہیں سفیدی تو نہیں جھلک رہی تھی۔ یادگار ان تمام معاملات میں میری معاون بھی تھی' مشیر بھی اور ... رازداں بھی! بالوں کو ڈائی کرتے ہوئے میں سر کے عقبی سمت اسی سے مدد لیتی۔ اگرچہ وہ خود بہت کم کاسمیٹکس استعمال کرتی لیکن مجھے اسی سے معلوم ہوتا کہ کیوٹیکس اور لپ اسٹک کے کون سے شیڈز فیشن میں تھے اور کون سے آؤٹ آف فیشن ہو چکے تھے۔

کپڑوں کے انتخاب میں اس کی اور میری پسند میں اکثر تضاد ہو جاتا۔ اسے پھیکے پھیکے اور دبے ہوئے رنگ اور باریک چھاپے والے کپڑے پسند آتے جب کہ میری نگۂ انتخاب شوخ رنگوں اور بڑے بڑے پرنٹس پر ٹھہرتی۔

"اگر آپ کو یہ پسند ہے تو ٹھیک ہے۔" وہ بہت سعادت مندی سے کہتی اور بڑی احتیاط سے اپنی رائے کا اظہار کرتی "ویسے مجھے وہ زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔"

"اگر تم کہتی ہو تو میں وہی لے لیتی ہوں۔" میں اس کا دل رکھنے کو کہتی۔

"نہیں نہیں..... " وہ اپنی رائے سے دست بردار ہو جاتی اور دکان دار سے کہتی "آپ یہی دے دیجئے۔"

اپنے لیے وہ ہمیشہ دبے دبے رنگ پسند کرتی۔

"یادو! لگتا ہے کسی بڑھیا کی روح گھس گئی ہے تم میں۔" ہم سب اسے پیار سے "یادو" ہی کہا کرتے تھے۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیتی اور کہتی "بس مجھے تو ایسے ہی رنگ اچھے لگتے ہیں۔"

کتنی عجیب بات تھی! اسے چھوٹی عمر میں "سوبر" رنگ پسند آتے تھے جب کہ مجھے اس عمر میں شوخ رنگ بھانے لگے تھے' ویسے شاید اتنی عجیب بھی نہیں تھی یہ بات۔

یادگار کی عمر میں مجھے بھی ایسے ہی پھیکے پھیکے رنگ اچھے لگا کرتے تھے!

○☆○

یادگار انٹر کا امتحان دے چکی تھی اور نتیجے کی انتہائی بے چینی سے منتظر تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر بنے۔

پروفیشنل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سخت داخلہ پالیسی کے مد نظر اس نے پری میڈیکل میں اچھے نمبروں کے حصول کے لیے دن رات ایک کر دیا تھا۔ مجھے بھی امید تھی کہ اس کا نتیجہ اچھا ہو گا اور وہ میڈیکل کالج میں داخلے کی اہل قرار پائے گی۔

انہی دنوں میرے لیے خاندان ہی سے ایک رشتہ آیا۔

امی جان کے ایک کزن تھے۔ اچھی پوسٹ پر فائز' خوش حال' اپنا گھر' گاڑی اور تین جوان بچے۔ بیوی کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ کسی ایسی خاتون سے شادی کرنا چاہتے تھے جو درمیانی عمر کی ہو اور ان کے جوان بچوں کی ماں نظر آئے۔ ان کا اجڑا ہوا گھر بسائے اور بچوں کے فرائض سے سبکدوش ہونے میں ان کی مدد و معاون ہو۔ ان کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی تھی!

امی اور بہنوں نے ہی نہیں' قریبی عزیزوں نے بھی مجھے بہت سمجھایا مگر میں نے انکار کر دیا۔ امی نے خفا ہو کر کہا "تم چاہتی ہو میں سکون سے نہ مر سکوں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں امی!" میں نے ہول کر کہا۔

"اور کیا...... یہی بات ہے ورنہ تم اپنی ضد پر کیوں اڑی رہتیں۔"

"یہ ضد نہیں ہے امی۔"

"تو پھر کیا ہے؟"

"یادگار کو میری زیادہ ضرورت ہے۔"

"پہلے بھی تم نے اسی کو بہانہ بنائے رکھا..... وہ اب بچی نہیں رہی' سمجھ دار ہے۔" مجھے امی کی اس بات سے دھچکا پہنچا۔

بہانہ! بہانہ تو نہیں تھا وہ! میں نے تو ابو جی سے کیا ہوا عہد نبھانے کی کوشش کی تھی۔

"امی جان!" میں نے بڑے تحمل سے کہا "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ یادگار بہت سمجھ دار ہے۔ اپنی عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ سمجھ دار..... مگر میں سمجھتی ہوں کہ اب اسے پہلے کے مقابلے میں زیادہ ضرورت ہے میری۔"

امی نے خشونت سے مجھے دیکھا۔

"اگر خدمت ہی کرنی ہے تو میں کسی اور کے بچوں کے بجائے اپنی یادو کا خیال کیوں نہ کروں۔ اسے میری ضرورت ہے۔"

"بڑھاپے میں سر پکڑ کر روؤ گی۔"

بڑھاپا! اب کیا کسر رہ گئی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور اندر ہی اندر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

کالج میں انیتا اکثر میرے ہاتھوں کو رشک سے دیکھتے ہوئے کہا کرتی تھی "آئی وش کہ میرے ہاتھ بھی تمہارے ہاتھوں کی طرح خوب صورت ہوتے۔"

کس قدر نرم و ملائم ہوا کرتے تھے میرے ہاتھ! مخروطی انگلیاں لمبے لمبے ناخنوں کی وجہ سے اور سبک لگتیں۔ ناخنوں پر گلابی مائل کیوٹیکس میرے ہاتھوں کو اور دلکش بنا دیتی۔

مگر چند سال قبل ایک موسم سرما کے دوران پہلی بار مجھے اپنے ہاتھوں کی جلد پر ہلکے سے تغیر کا احساس ہوا تھا۔ آئندہ چند برسوں کے دوران یہ تغیر بتدریج نمایاں ہوتا چلا گیا تھا۔ اب میرے ہاتھوں کی جلد پہلے کی طرح ہموار اور ملائم نہ رہی تھی۔ بہت باریک باریک سی لکیریں پڑ گئی تھیں میرے ہاتھوں پر جو بغور دیکھنے پر مربعوں اور مخروطوں کی شکل میں زیادہ نمایاں نظر آنے لگتیں۔ انگوٹھوں اور انگلیوں کی جڑوں میں جلد ڈھیلی ڈھیلی اور شکن دار سی دکھائی دیتی۔

"امی جان! میں شادی نہیں کروں گی۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

امی نے چونک کر میری طرف دیکھا کہ پہلی بار میں نے دو ٹوک لہجے میں شادی سے انکار کیا تھا۔ یادگار نے مجھ سے کہا "خالہ جانی! پلیز نانی جان کی بات مان لیں نا۔"
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے خجل ہو گئی پھر بولی "پلیز!"
"بری بات" میں نے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بچے بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیتے۔"
"اوہ! خالہ جانی میں..... میں بچی نہیں رہی۔"
"بوڑھی ہو گئی ہو!" میں نے اسے پیار سے گھورا "دادی اماں بن گئی ہو!"
"چلیں یہی سمجھ لیں مگر شادی کر لیں۔"
"بھئی تمہیں میری شادی کی فکر کیوں ہو گئی۔"
"نانی جان اور سب لوگ یہی چاہتے ہیں۔"
"بے کار کی باتیں کرتے ہیں سب۔"
"میں..... میں گلٹی فیل کرتی ہوں خالہ جانی۔" وہ بوجھل آواز میں بولی۔
"کیوں؟" میں نے چونک کر کہا۔
"آپ نے..... آپ نے میری وجہ سے دی ہے نا اتنی بڑی قربانی۔" اس نے سر جھکا کر رقت آمیز لہجے میں کہا۔
میں نے تڑپ کر اسے گلے سے لگا لیا اور کہا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔"
وہ سسکنے لگی۔
"میں نے یہ فیصلہ تمہاری خاطر نہیں اپنے لیے کیا تھا میری جان۔" میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔
"اپنے لیے! کیا مطلب؟" اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"ہاں۔" میں نے دھیرے سے کہا۔
"کیوں؟ کیوں کیا آپ نے یہ فیصلہ؟" اس کے لہجے میں تجسس تھا اور تشویش بھی۔
"بس تھی کوئی بات۔" میں نے اس سے نظریں چرا رکھی تھیں۔
"مجھے بتائیں نا۔"
"پھر کبھی..... پھر کبھی بتاؤں گی۔"
"پرومس؟"
"پرومس!"
اس کی سسکیاں تھم گئی تھیں۔
اس کے دل سے "GUILT" دور کرنے اور اسے مطمئن کرنے کے لیے میں نے جو حربہ آزمایا وہ کارگر رہا تھا!

OOO

یادگار کا نتیجہ نکلا تو اس نے حسب توقع بہت اچھے نمبر حاصل کیے تھے۔ میڈیکل کالج میں اس کے داخلے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔
منجھلی آپا بہت خوش تھیں "یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا ہے۔" انہوں نے مجھ سے کہا اور اس سے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
"جی نہیں۔" میں نے کہا "یہ سب یادگار کی اپنی محنت اور قابلیت کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔"
یادگار کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ امی جان بھی خوش تھیں۔ بڑی آپا نے ہمدردانہ انداز میں مجھے سمجھایا "اب تو تم نے یادگار کو اس کی منزل تک پہنچا دیا' اب اپنی فکر بھی دور کر ڈالو۔"
"ابھی کہاں بڑی آپا..... ابھی یادگار کی منزل بہت دور ہے..... کم سے کم پانچ سال۔" میں نے کہا۔
"اب اس سے آگے وہ خود جا سکتی ہے۔"
"چھوڑیں اس قصے کو..... کوئی دوسری بات کریں۔"
"تم امی کو بہت دکھ دے رہی ہو۔" بڑی آپا نے قدرے خفگی سے کہا۔
"بڑی آپا!" میں نے گھٹی گھٹی ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "میں شادی کی صحیح عمر سے بہت دور نکل آئی ہوں..... آپ سب کے بچے بھی بڑے ہو چکے ہیں اب شادی کر کے کیا کروں گی۔"
"انگریز کہتا ہے IT IS NEVER TOO LATE۔" بڑی آپا بولیں۔
"لیکن یہ کہنے تک انگریز خود تو ایک بچہ یہاں دو وہاں چھوڑ چکا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"تم غلطی کر رہی ہو۔"
وہ تو میں بہت پہلے کر چکی تھی۔
منجھلی آپا سے ڈیڑھ ہی برس چھوٹی تو تھی میں۔ اگر وقت پر شادی ہوئی ہوتی تو شاید اس وقت میرے ایک دو بچے کالج میں پڑھ رہے ہوتے۔
خیر جو نہیں ہو سکا تھا اور جو ہوا تھا' میں نے دونوں ہی سے انتہائی خوش دلی سے مفاہمت کر لی تھی اور شاید اسی لیے لوگوں سے میرے رویے میں جارحانہ کیفیت نہ آئی تھی۔
ہاں البتہ جس بات سے میں مفاہمت نہ کر پائی تھی وہ میری بڑھتی عمر کے اثرات تھے جنہیں زائل کر دینے کے لیے میں ہر تدبیر آزماتی پھر بھی سیماب کی طرح بے قراری رہتی۔
بہت پہلے شگفتہ کی شادی کے چند برس بعد کی بات تھی جب میرے بالوں میں کہیں کہیں سفید بال جھلکنا شروع ہوئے تھے۔ شگفتہ ایک مرتبہ تعطیلات میں پاکستان آئی تو اس نے میرے سفید بالوں کی جھلک دیکھ کر مجھے ٹوکا تھا "باجی! آپ کے بال سفید ہو رہے ہیں۔"
"ہاں مجھے پتا ہے۔" میں نے کہا تھا۔
"پتا ہے تو ڈائی کیوں نہیں کرتیں یا مہندی لگایا کریں....."

چھپ جائیں گے۔" اس نے مشورہ دیا۔

"کیوں چھپاؤں بھئی۔۔۔ مجھے تو بہت اچھے لگتے ہیں اپنے یہ سفید بال۔"

"رئیلی!" شگفتہ نے یوں کہا جیسے اسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو۔

"ہاں۔" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"وہاں۔۔۔ امریکا میں تو مرد اور عورتیں اپنے سفید بال چھپانے کے لیے نہ جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔"

"پاگل ہیں وہ۔" میں نے کہا "میں تو چاہتی ہوں میرے سارے بال جلدی جلدی سفید ہو جائیں۔ کتنی سوبر اور گریس فل لگوں گی میں۔"

شگفتہ نے حیرانی اور بے یقینی سے میری جانب دیکھا اور بولی۔

"آپ مذاق کر رہی ہیں!"

"نہیں بھئی سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔ مجھے تو بوڑھا ہونا بہت اچھا لگتا ہے۔"

"ہائے! وہاں تو جب لوگوں پر بڑھاپا آنے لگتا ہے تو وہ پاگل ہونے لگتے ہیں۔۔۔ MIDDLEAGE CRISIS وہاں کے لوگوں کی زندگی کا بدترین دور ہوتا ہے۔"

"پاگل ہیں وہ لوگ۔۔۔ مجھے تو سفید بال' سفید پلکیں' سفید بھویں بہت اچھی لگتی ہیں جیسے برف جمی ہو۔"

"پتا نہیں۔" شگفتہ متذبذب لہجے میں بولی۔

"کیا پتا نہیں؟"

"کہ پاگل وہ ہیں یا۔۔۔" غالباً میرے بڑے پن کا لحاظ رکھتے ہوئے اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یا میں!" میں مسکرا دی۔

شگفتہ مجھے الجھی الجھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تم دیکھنا میں کتنی خوش رہا کروں گی بوڑھی ہو کر۔"

مگر۔۔۔! میری خوش فہمیوں نے میرا منہ چڑا دیا تھا "مڈل ایج کرائسس" بالفاظِ دیگر بڑھتی عمر کے احساس نے میرے دل و دماغ کو ایک نفسیاتی بحران اور ایک اعصابی جنگ سے دوچار کر دیا تھا! میں جو بڑھاپے سے خائف نہ ہونے اور بڑھاپے میں خوش رہنے کے دعوے کیا کرتی تھی' جوانی کو خیرباد کہتے ہی شکست و ریخت کا شکار ہو گئی تھی۔ ظاہری و باطنی جسمانی تبدیلیوں نے مجھے ایک نفسیاتی بحران سے دوچار کر دیا تھا۔ سفید بالوں کو سیاہ رکھنے کی کوشش میں' میں اتنی باقاعدگی سے ہیئر ڈائی کرتی کہ ڈائی کے مضر اثرات کے نتیجے میں میرے بالوں کی جڑیں اتنی کمزور ہو گئی تھیں کہ جب میں کنگھا کرتی تو کنگھا ٹوٹنے والے بالوں کے گچھے سے اٹ جاتا۔

اپنے چہرے کو شاداب رکھنے کی خاطر میں نہ جانے کون کون سی تدبیریں آزماتی۔ میری ڈریسنگ ٹیبل نوع بنوع کاسمیٹکس سے آراستہ رہتی۔ ماضی کی یادیں کوئل کی کوک کی طرح میرا دل دکھاتیں!

○☆○

وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے۔

یادگار کا میڈیکل کالج میں داخل ہونا کل کی بات لگتی تھی۔

اور بعض باتیں کتنی دیر سے ہماری سمجھ میں آتی ہیں!

جب میں چھوٹی سی تھی تو امی جان اکثر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا کرتی تھیں "مجھے اپنا بچپن کبھی کبھی بہت یاد آتا ہے۔"

میں حیران ہو کر سوچتی "امی جان کو اپنا بچپن بھلا کیوں یاد آتا ہے!"

یادگار ہاؤس جاب کر رہی تھی اور امی جان کی بات کا مطلب میری سمجھ میں بخوبی آ چکا تھا۔

بلکہ اب تو اس عبارت کے مفہوم سے بھی میں آشنا ہو چکی تھی جو میں نے اپنے اسکول کے زمانے میں ہر ہر سطر قہقہہ بار ہونے کا دعویٰ رکھنے والے' طالبات کے لیے ممنوعہ رسالے میں پڑھی تھی کہ "عورت ایک معما ہے۔ جب وہ بچی ہو تو جوان نظر آنے کی کوشش کرتی ہے' جوان ہو تو بڑھاپے کو رشک سے دیکھتی ہے اور جب بوڑھی ہو جائے تو جوانی کو یاد کرتی ہے۔"

اسکول کے ابتدائی برسوں میں مجھے "باجیاں"! ان کے قیامت خیز خطوطِ بدن' اسکول کے احاطے میں گھنے درختوں تلے ان کے آپس کے راز و نیاز' کلاس میں دبی دبی سرگوشیاں' معنی خیز ہنسی' ان کی متوالی چال' آنکھوں میں ڈولتا خمار' لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ' سب کچھ کس قدر FASCINATE کرتا تھا!

میں باجیوں کو رشک سے دیکھتی اور اس آتشِ شوق کی جھلک اپنی ہم سنوں کی نگاہوں میں بھی پاتی! میرا جی چاہتا' میں جلد از جلد باجیوں جتنی بڑی ہو جاؤں۔ ان کے ساتھ بیٹھوں' ان کی دبی دبی سرگوشیوں اور معنی خیز ہنسی میں شریک ہوں۔

وقت سے پہلے ہی بڑی ہونے کی کوشش میں ہم چھوٹی لڑکیاں باجیوں کو اپنا آئیڈیل بنا کر ان کی چال ڈھال اور طور طریقوں کی نقل کرنے کی کوشش کرتیں اور موقع ملتے ہی مور کے پر لگا کر ان میں جا گھسنے کی کوشش کرتیں۔ خود کو "بڑا" ظاہر کرنے کے شوق میں چھوٹی لڑکیاں بسا اوقات ایسے طریقے اختیار کرتیں کہ اب یاد کرتی ہوں تو۔۔۔!

باجیوں کی نقل کرنے کی بات پر مجھے یاد آیا' دسویں جماعت کی ایک باجی کی ان کے سالانہ امتحان سے کچھ عرصہ قبل شادی ہوئی۔ شادی کے بعد وہ اسکول آئیں تو انہوں نے اسکول فراک کو اتنا کلف لگا رکھا تھا کہ جب وہ چلتیں تو فراک کا کلف سے اکڑا ہوا گھیرا دھیرے دھیرے مرتعش ہوتا۔ اگلے دن اسکول میں بے شمار لڑکیوں نے کلف لگی فراکیں پہن رکھی تھیں اور چند ہی دنوں میں یہ عالم ہوا کہ اسکول میں یہاں سے وہاں تک کلف لگی فراکوں کے گھیرے دھیرے دھیرے مرتعش نظر آتے اور اس دوڑ میں ہم چھوٹی لڑکیاں باجیوں سے دو ہاتھ آگے رہیں!

میں اپنا بچپن یاد کرتی تو مجھے مذکورہ عبارت کا ابتدائی حصہ سچ محسوس ہوتا!

جوانی میں مجھے اپنے بالوں کی اگلی لٹوں میں کوندتے اِکّا دُکّا سفید بال انتہائی عزیز ہوا کرتے تھے۔ شگفتہ سے میں نے کہا تھا "میں تو چاہتی ہوں' میرے سارے بال جلدی جلدی سفید ہو جائیں۔ کتنی سوبر اور گریس فل لگوں گی میں!"

عبارت کا درمیانی حصہ بھی اب میری سمجھ سے بالاتر نہ رہا تھا!

اور اب آخری حصے کا مفہوم بھی دھیرے دھیرے کھلتا جا رہا تھا مجھ پر!

نوجوان لڑکیوں کے شاداب چہرے مجھے ایک احساسِ محرومی سے دوچار کردیتے۔ ان کے پاس وقت تھا۔ میری مٹھی خالی ہو چکی تھی! کالی بھجنگ اور بدنقوش لڑکیاں بھی مجھ سے اچھی لگتیں۔ سچ کہا ہے کسی نے جوانی میں گدھی پر بھی روپ آجاتا ہے۔ واقعی جوانی کا اپنا حسن ہوتا ہے۔

اب یہ راز بھی کھل چکا تھا مجھ پر کہ اسکول اور کالج کے زمانے میں سڑکوں پر اور پبلک بسوں میں آتے جاتے بس کے مردانہ حصے میں سوار مسافروں کی نگاہیں لپے پتے چہروں اور خوش رنگ ملبوسات والی عورتوں کے بجائے ہم لڑکیوں کے چہروں کے طواف کیوں کیا کرتی تھیں اور زنانہ حصے میں سوار عورتیں ہم لڑکیوں کو کبھی للچائی اور کبھی نفرت بھری نگاہوں سے کیوں دیکھا کرتی تھیں۔

نوعمر لڑکیوں کے زندگی سے بھرپور قہقہے سن کر میرے دل میں ہوکیں سی اٹھنے لگتیں۔ آہ! میری ہنسی تو نہ جانے کون سی پاتال میں جا اتری تھی۔ میں آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو میرا دل دکھنے لگتا۔ وہ دلکش چہرہ جسے دیکھ کر انجانا پوچھا کرتی تھی "تمہاری اسکن اتنی نرم وملائم کیسے رہتی ہے؟" نہ جانے کس اور جا چھپا تھا۔

اب تو آئینے میں جو چہرہ نظر آتا تھا' اس کی جلد ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ پیشانی پر لکیریں نظر آتی تھیں۔ آنکھوں کے پپوٹے بھاری رہتے۔ آنکھوں کے نیچے جلد شکن آلود اور ٹھوڑی دہری ہوتی جا رہی تھی۔ ہنستے وقت ہونٹوں کے دائیں بائیں ناک کے نتھنوں کی جڑوں سے ہونٹوں کے گوشوں تک اور آنکھوں کے پاس بڑی بدنما سی لکیریں پڑتیں۔

فیشل' ماسک اور بدیسی لوشنز کا بھی جیسے کچھ اثر نہ رہا تھا۔ میک اپ کی تہیں بھی پہلے کی سی بات لاتا تو کجا وقت کے ساتھ پیدا ہو جانے والی خامیاں نہ چھپا پاتیں۔ بلکہ سچ تو یہ تھا کہ اب کبھی کبھی تو میک اپ کے دوران آئینہ مجھ پر ہنسنے لگتا اور میں اس کی ہنسی سے خائف ہو کر کبھی اپنے چہرے پر پاؤڈر کی تہ ہلکی کردیتی' کبھی روج دھیما کردیتی۔ کبھی جھنجلا کر آئی شیڈو اتار دیتی' کبھی ہونٹوں پر لپ اسٹک کا شیڈ تبدیل کردیتی۔ میرا دل سرد آہیں بھرنے پر مجبور ہو جاتا۔ لاکھ تدبیریں آزمانے کے باوجود آئینہ مجھے پہلا سا عکس نہ دکھا پاتا!

میری گردن پر حلقوم سے ہنسلی تک آگے پیچھے گہری گہری متوازی لکیریں پڑ گئی تھیں جیسے وقت نے میری گردن کو نہ ٹوٹنے والے گہرے شکنجوں میں جکڑ ڈالا ہو۔ کچھ ایسے ہی شکنجے میرے ہاتھوں کی جڑوں سے کلائیوں تک پڑے نظر آتے تھے۔ میرے ہاتھوں اور بازوؤں پر لکیریں زیادہ گہری ہو گئی تھیں۔ ہینڈ لوشن لگانے سے بھی پہلے کی سی بات نہ آتی۔

آہ! وہ نرم وملائم ہاتھ جنہیں انجانا رشک سے دیکھا کرتی تھی' قصۂ پارینہ بن چکے تھے۔ اب تو کھردرے اور بے رونق ہاتھ تھے اور قدرتی چمک سے محروم کلائیاں۔ ناخنوں کی چمک بھی معدوم ہو چکی تھی۔ مخروطی انگلیاں دلکشی کھو چکی تھیں۔ ہتھیلیوں کی لکیریں بھی شکست وریخت کا شکار ہو چکی تھیں۔ بالکل میری طرح! بلکہ آئینے میں نظر آنے والے میرے عکس کی طرح!

امی جان تو ناحق اپنا بچپن یاد کرتی تھیں۔ اگر مجھ سے پوچھا جاتا کہ یاد کرنے اور یاد رکھنے والی چیز کیا ہے تو میں بلا تردّد کہتی "جوانی!"

آہ جوانی! کیسی کیسی یادیں وابستہ تھیں عہدِ جوانی سے' فارغ وقت میں اکثر میں پرانی تصویریں لے کر بیٹھ جاتی اور دیکھنے لگتی۔ ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے میرا دل ایک کسک سے دوچار ہو جاتا۔

وقت کا بے رحم ہاتھ ہماری تصویروں کو کس بری طرح بگاڑتا ہے! اپنی جوانی کی یاد مجھے اک احساسِ ملال سے دوچار کردیتی جبکہ ...اوروں کی جوانی پر مجھے رشک آتا۔

تاہم یادگار اپنی تمام تر دلکشی کے باوجود اس رشک سے ماورا تھی!

○☆○

یادگار تو میری جان تھی! اسے دیکھ کر چاند چہرہ ستارہ آنکھیں کے معنی سمجھنا دشوار نہ رہتے۔ اس کی سروقامتی اسے ہجوم میں بھی ممتاز رکھتی۔ اس کی رنگت ماہتابی تھی۔ بال سیاہ۔ پیشانی فراخ تھی۔ ناک ستواں۔

وہ مسکراتی تو اس کے رخساروں پر گڑھے پڑتے اور مسکان لبوں پر ہی نہ کھیلتی' آنکھوں میں بھی ہلکورے لینے لگتی۔

اس کی ہنسی میں بے ساختگی تھی۔ تکلم میں برجستگی۔ چال میں اس بلا کا اعتماد تھا جیسے ہفت اقلیم زیرِ نگیں کرکے چلی آرہی ہو۔ جو لباس اس کے سراپا پر سج جاتا' انمول ہو جاتا۔

اسے دیکھ کر میرے رگ وپے میں بے پایاں مسرت کا احساس سرایت کر جاتا۔ ممتا کے جذبے سے نابلد ہونے کے باعث میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتی کہ وہ مجھے اولاد کی طرح عزیز تھی تاہم اسے دیکھتے ہوئے میں اکثر یہ سوچتی کہ اگر مجھے اس سے اتنی محبت ہے تو مجھلی آپا کو ماں ہونے کے ناتے کتنی بے پایاں محبت ہوگی اس سے!

پدری شفقت سے محرومی اور ماں کی قربت سے دوری نے یادگار کو اس کی عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ سمجھ دار اور بردبار بنا دیا تھا جس کا نہ صرف مجھے اور دوسرے لوگوں کو بلکہ خود اس کو بھی بخوبی احساس تھا تبھی تو اس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا۔

"خالہ جانی! کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے' اتنا ہنسوں اتنا کہ میرے آنسو نکل آئیں۔"

میں نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں دعا کی تھی۔

"اے خدا! میرے حصے کی خوشیاں بھی یادگار کے نام کر دینا!"

یادگار کی ہاؤس جاب مکمل ہونے پر میں نے ایک جشن کا اہتمام کیا جس میں خاندان کے لوگوں کے علاوہ یادگار کے ہم جماعت بھی شریک ہوئے۔ اس تقریب کا منظر اب بھی میری نگاہوں میں پھرتا ہے۔ یادگار اس روز اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ مجھے اس پر ٹوٹ ٹوٹ کر پیار آتا تھا۔

یادگار کے ڈاکٹر بننے کی خوشی ابھی تازہ ہی تھی کہ امی جان بیمار ہو گئیں۔ کچھ دنوں فیملی ڈاکٹر سے علاج ہوتا رہا مگر ان کی طبیعت نہ سنبھلی بلکہ وزن تیزی سے کم ہونے اور بدن گھٹنے لگا۔ مرض کی تشخیص کے لیے ٹیسٹ ہوئے تو پتا چلا وہ سرطان کا شکار ہو چکی تھیں۔ ماہر ڈاکٹروں کی رائے میں اس کا یقینی سبب امی جان کی بہت زیادہ پان کھانے کی عادت تھی۔

سب کتنا منع کیا کرتے تھے امی کو کہ زیادہ پان نہ کھایا کریں مگر وہ کہا کرتی تھیں "کھانے کے بغیر زندہ رہ سکتی ہوں مگر پان کے بغیر نہیں۔"

مجھے امی جان کے پانوں کا کتنا خیال رہا کرتا تھا! سقوطِ ڈھاکا کے بعد جب پانوں کا کال پڑا تو میں ان کے لیے کہاں کہاں سے پان ڈھونڈ کر لایا کرتی تھی۔ ان دنوں اچھے اچھوں کو امرود کے پتے چباتے دیکھا گیا مگر میں نے امی جان کا پاندان پانوں سے خالی نہ ہونے دیا تھا اور بعد میں گھر کے احاطے میں پانوں کی بیلیں پھیلوا دی تھیں۔ امی جان ایک ایک کو خوش ہو کر بتاتی تھیں "میری حبیبہ نے میرے لیے گھر ہی میں پان لگوا دیے ہیں" مہمان آتے تو امی پان نہ کھانے والوں کو بھی پان کھلاتیں۔

کاش! کاش مجھے پتا ہوتا کہ امی کی پان خوری کی عادت کیا رنگ دکھائے گی!

بائیوپسی (BIOPSY) کے بعد امی کی حالت روز بہ روز بگڑتی چلی گئی۔ اف خدایا! وہ ڈیڑھ دو ماہ کا عرصہ کس قدر کرب انگیز تھا۔

گھر میں پانوں کی بیلیں اسی طرح پھیلی پڑی تھیں مگر امی جان ان سے قطع تعلق کر چکی تھیں اور اسپتال کے ایک کمرے میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی تھیں۔

ڈاکٹر مایوس تھے۔ میں نے دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی اور میرے روز و شب امی جان کی تیمارداری میں گزر رہے تھے۔ یادگار لمحہ لمحہ میرے ساتھ ہوتی۔ امی کی دیکھ بھال کرتی اور مجھے دلاسا دیتی۔

شگفتہ اور رعنا بھی آگئی تھیں۔ ساری بہنیں بہت اداس اور فکرمند تھیں۔

موت کے ہاتھ امی کی طرف اور امی کے قدم موت کی جانب بڑھ رہے تھے۔

آہ! اپنی عزیز ترین ہستی کو موت کی طرف بڑھتے دیکھنا کیسا اذیت ناک تجربہ ہوتا ہے۔ مجھے امی کی نہ جانے کب کب کی اور کون کون سی باتیں یاد آتیں۔ مجھے شادی پر آمادہ کرنے کے لیے وہ کتنی منت سماجت کیا کرتی تھیں میری!

امی کے زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے جتنے آنسو میری آنکھوں سے بہتے اس سے کہیں زیادہ میرے دل میں اترتے چلے جاتے۔ جب میں تنہا امی کے کمرے میں ہوتی تو میرے آنسو تھمنے نہ پاتے لیکن بہنوں کے سامنے میں اپنے آنسوؤں پر ضبط کا پہرا بٹھا کر بڑے حوصلے سے انھیں تسلی دیتی۔

امی کے سرہانے انہی کرب ناک دنوں میں ایک روز میں نے جی ہی جی میں اللہ سے کہا "اے اللہ! میرے پاس تو امی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان کے بغیر میں کیسے جی سکوں گی۔"

اسپتال کے اسی کمرے میں ایک شب مصلے پر سجدہ ریز ہو کر میں نے گڑگڑاتے ہوئے اللہ میاں سے کہا "امی اچھی ہو جائیں تو میں شادی بھی کرلوں گی خواہ کسی نامناسب آدمی ہی سے سہی۔"

مگر.....!

کاش! کاش! امی جان ایک بار تو موت کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیتیں۔

امی کی موت کے بعد مجھے زندگی بڑی بے معنی سی لگنے لگی۔ میں بہت اداس تھی۔ کہیں جی نہ لگتا۔ میری روح میں ایک سناٹا سا اتر گیا تھا۔ میں خود کو بہت تنہا پا رہی تھی۔

راتوں کو میں خوابوں میں ننگے پاؤں اور برہنہ سر جنگل در جنگل امی جان کو پکارتی پھرتی۔ امی! امی! امی!

آنکھ کھلتی تو میرا تکیہ آنسوؤں سے نم ہوتا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ میں خود کو اتنی کمزور اور بے بس محسوس کر رہی تھی کہ بہنوں کو دلاسا دینے اور ان کی ہمت بندھانے کے بجائے خود کو ان کے دلاسوں کی محتاج پا رہی تھی!

دفتر سے کافی دن چھٹی پر رہنے کے بعد جب میں دوبارہ دفتر گئی تو میرے بالوں کی جڑوں میں پھیلی سفیدی چغلی کھا رہی تھی کہ میں نے بالوں کو ڈائی نہیں کیا تھا۔ میک اپ نہ کرنے کے باعث میرا چہرہ انتہائی بے رونق لگ رہا تھا۔ روح میں بیابان جنگل کی سی ویرانی تھی اور دل اداس تھا۔

میرے رفقائے کار تعزیت کے لیے میرے کمرے میں آئے تو مجھے یوں لگا جیسے میرا دل آنکھوں کے رستے بہہ جائے گا۔

اس شام دفتر سے واپسی پر امی کے کمرے میں بیٹھ کر میں اتنا روئی کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ امی اکثر کہا کرتی تھیں "شادی کرلو حبیبہ ورنہ میرے بعد باقی سب بہنیں تو اپنے گھروں اور بچوں میں گم ہو جائیں گی، تم اکیلی رہ جاؤ گی۔"

میں واقعی اکیلی رہ گئی تھی!

گھر میں یادگار کی موجودگی بھی میری ڈھارس نہ بندھا پا رہی تھی۔

○☆○

امی جان کی موت کو چھ ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ میں ان کی جدائی کے صدمے کو یکسر تو نہ بھلا سکی تھی تاہم وقت کے ساتھ ساتھ اس غم کی شدت میں بتدریج افاقہ ہوتا چلا گیا تھا۔

میں اب ہنسنے والی باتوں پر ہنسنے بھی لگی تھی اور مسکرانے والی باتوں پر مسکرا بھی دیتی تھی مگر اس صدمے نے میرے دل کی دنیا یکسر بدل ڈالی تھی اور میرے من میں ایک ناقابلِ بیان سناٹا جڑ پکڑ چکا تھا ایک مستقل سناٹا!

ایسا سناٹا جس نے مجھے اپنے آپ سے بے نیاز کردیا تھا۔ میں اپنی ذات سے بے التفاتی برتنے لگی تھی۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے بھی میں کوئی خاص اہتمام نہ کرتی۔ میں نے شوخ رنگ ملبوسات پہننا ترک کردیے اور اکثر سفید یا سیاہ لباس پہنتی۔ درزی کے ہاں میری آمدورفت برائے نام رہ گئی تھی۔ بالوں کو ڈائی کیے اکثر اتنے دن گزر جاتے کہ مانگ میں اور پیشانی کے پاس سفیدی جھانکنے لگتی۔

مجھے میک اپ سے کوئی رغبت نہ رہی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر کاسمیٹکس میری بے التفاتی کا شکوہ کرتی نظر آتیں۔ میں زیادہ سے زیادہ اتنا کرتی کہ دفتر یا گھر سے باہر کہیں جاتے ہوئے دھیمے سے شیڈ کی لپ اسٹک لگالیتی۔

امی کی موت نے مجھے بہت کمزور کردیا تھا۔ گھر میں یادگار اکثر کہتی "خالہ جانی! نانی جان کے انتقال کے بعد آپ تو بالکل بدل گئی ہیں۔"

بہنیں کہتیں "یہ کیا حلیہ بنائے رکھتی ہو!"

دفتر والے کہتے "مس حبیبہ! آپ تو بالکل چینج ہوگئی ہیں۔"

امی کی موت نے میرے دل سے اس جوش اور ولولے کو مٹا ڈالا تھا جو زندگی کے پُرمعنی اور دل فریب ہونے کا یقین دلاتا ہے۔

میں کسی بیوہ کی طرح اجاڑ اور سوگوار رہنے لگی تھی۔

امی کے جانے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے ان سے کتنی محبت تھی اور ان کی ذات میرے لیے کتنی اہم تھی۔ ان کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ابوجی سے میری انسیت تو امی سے میری محبت کا عشرِ عشیر بھی نہ تھی۔ امی جان کی موت کے بعد ان کی زندگی کے جس فیض کا انکشاف مجھ پر ہوا وہ غالباً یہ تھا کہ امی خود کمزور ہو کر بھی میری قوت کا باعث تھیں۔ ان کی موجودگی میں، مَیں نے بڑی سے بڑی مشکل کا حوصلے سے سامنا کیا۔ ہر سانحے کا میں نے اس خیال کے پیشِ نظر خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا کہ امی رنجیدہ نہ ہونے پائیں۔ شوکت بھائی کی موت کے بعد میں نے انہیں دلاسا دیا تھا۔ ابوجی کے انتقال کے بعد میں نے انہیں تنہا نہ ہونے دیا تھا۔ ان کا دل لمحہ لمحہ اپنی مٹھی میں لیے رہی تھی مگر امی کے بعد میرا اپنا دل کملا گیا تھا!

وہ دل جو نہ جانے کیا کچھ اپنے اندر سموئے بیٹھا تھا۔ کیسی کیسی یادیں بندھی تھیں اس دل کی ڈور سے!

میرے لیے امی کی موجودگی کا سب سے بڑا معجزہ یہ تھا کہ عمر بڑھنے کے باوجود ان کی موجودگی میں، مَیں اپنے اوپر عمر رسیدگی کا احساس طاری نہ ہونے دیتی تھی اور بظاہر جوان ہی نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔ امی کی موت کے بعد میں اڑتالیس سال کی عمر میں ساٹھ سال کی عورت کی طرح بوڑھی دکھائی دینے لگی تھی۔ میری چال ڈھال سے تمکنت جاتی رہی تھی۔ زیادہ چلتی تو گھٹنے اور تلوے دکھنے لگتے۔

آہ! کبھی میں اور تھکن دو متضاد باتیں ہوا کرتی تھیں مگر اب! اب تو تھکن اور درد کمن جیسے گھٹنوں اور تلووں میں دھرنا دے کر بیٹھ گئے تھے۔

اور دل گھٹنوں اور تلووں سے زیادہ دکھتا!

○☆○

حیف اے وقت کتنا منافق ہے تو کہ ایک ہاتھ سے گھاؤ لگاتا ہے دوسرے سے مرہم!

امی کی پہلی برسی ہوچکی تھی۔ میں امی کی جدائی کی عادی ہوچکی تھی۔

مجھلی آپا یادگار کے لیے کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھیں۔ یوں تو ایک رشتہ اس کے بچپن ہی سے گھر ہی میں ہم سب کی نظر میں تھا اور وہ تھا شگفتہ کا بیٹا مگر صاحب زادے اکیس برس کی عمر ہی میں اپنی ایک بنگالی ہم جماعت کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہونے کے بعد ہم سب کی امیدوں پر پانی پھیر چکے تھے۔

رشتہ مجھلی آپا کے اپنے گھر میں بھی تھا اور وہ تھا ان کے میاں کی مرحومہ بیوی کا بیٹا مگر اس کے لیے یادگار قطعاً آمادہ نہ تھی۔ مجھلی آپا کے ایما پر میں نے ہی بات کی تھی اس سے مگر اس نے صاف انکار کردیا تھا۔

"کیوں بھئی! اتنا اچھا لڑکا ہے۔ ہینڈسم، پڑھا لکھا اور برسرِ روزگار۔" میں نے کہا۔

میری بات پر یادگار نے گھائل نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور شاکی لہجے میں بولی "یہ بھی تو کہئے خالہ جانی کہ وہ اور اس کی بہن ہی میرے دشمنِ جاں ہوا کرتے تھے ماما کے گھر میں۔"

"بچے! جو وقت گزر گیا اسے بھول جاؤ۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں..... نہیں خالہ جانی۔" یادگار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دوٹوک لہجے میں کہا "میں یہ بات ساری زندگی نہیں بھلا سکتی کہ ان دونوں بھائی بہن کی وجہ سے ہی میں اپنی ماما کے پاس نہیں رہ سکی۔"

"اوہ!" میں نے چونک کر یادگار کی جانب دیکھا۔ اس کی خاطر تو میں نے اپنی ذات کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ قربانی دی تھی اس کے لیے..... کیا میری تمام تر محبت کے باوجود اس کی زندگی میں ماں کی قربت سے محرومی کا خلا رہ گیا تھا!

"بیٹا! کیا میں نے اور نانی جان نے تمہارا خیال نہیں رکھا۔"

میں نے کہا۔

"میں آپ کا اور نانی جان کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی خالہ جانی!" وہ دھیرے سے بولی۔

"خدانخواستہ میں جتا نہیں رہی..... میں تو صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا پھر بھی تم نے اپنی ماما کو مس کیا؟"

"وہ تو بالکل قدرتی بات تھی خالہ جانی..... ماں تو ماں ہوتی ہے۔" یادگار نے کہا۔

میں چند ثانیے ایک سکتے کی کیفیت میں رہ گئی پھر میں نے گھٹی گھٹی ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے اثبات میں سرہلا دیا۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ وہ گھٹی گھٹی سرد آہ میں نے یادگار کے احساسِ محرومی پر کھینچی تھی یا اپنے کربِ نارسائی پر!

یادگار کا اس کی ماں سے زیادہ خیال رکھ کر اور ماں سے زیادہ محبت دے کر بھی میں.....!

میں ایک بڑے دھچکے سے دوچار ہوئی تھی!

تاہم میں نے اپنی اصل کیفیت یادگار پر ظاہر نہ ہونے دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ اگر تم نہیں چاہتیں تو میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ دنیا میں اچھے لڑکوں کی کمی نہیں۔ ہم کوئی اور دیکھیں گے۔"

"آپ نے میری بات کا برا تو نہیں منایا؟" یادگار نے میرے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے پیار سے کہا۔

"نہیں میری جان' اس میں برا منانے کی کیا بات..... تم ایک پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکی ہو۔ تمہیں پورا اختیار ہے اس بات کا کہ تم جس سے شادی نہ کرنا چاہو' انکار کر دو۔"

"میں..... میں اس کی بات نہیں کر رہی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"تو پھر؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ نے میری اس بات کا برا نہیں منایا جو میں نے ماما کے بارے میں کہی۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ....." اس نے توقف کیا پھر قدرے ہچکچاتے ہوئے اور مجھ سے نظریں چرا کر بولی "ماں تو ماں ہوتی ہے۔"

"نہیں..... قطعاً نہیں" میں نے کہا "تم نے غلط تو نہیں کہا اور..... مجھے سچ بولنے والے لوگ ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔"

یادگار کی بانہیں ہنوز میرے گلے میں حمائل تھیں۔ میں نے گردن کو خفیف سا موڑا اور اپنے ہونٹ اس کے بازو سے مس کرتے ہوئے دھیرے سے اس کا بازو چوم لیا مگر میری پلکیں بھیگ گئی تھیں!

میں نے منجھلی آپا کو یادگار کی مرضی سے آگاہ کیا تو وہ بولیں۔

"اسے سمجھاؤ کہ کہیں باہر نہیں جانا پڑے گا۔ گھر کی گھر میں رہے گی۔ لڑکا تو ماشاء اللہ ہے ہی اچھا..... میں نے اتنی محنت کی ہے اس کے ساتھ' دوسرے فائدہ کیوں اٹھائیں۔"

"منجھلی آپا! میرا خیال یہ ہے کہ یادگار پر اس کی مرضی کے خلاف دباؤ نہ ڈالا جائے۔ وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔"

"پھر بھی ایک کوشش تو کر دیکھو۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

تاہم بعد میں منجھلی آپا نے یادگار سے خود بھی بات کی اور یادگار نے انہیں بھی انکار کر دیا۔ ہم اس کے لیے کسی اور مناسب رشتے کی تلاش میں لگ گئے۔

O☆O

افسوس صد افسوس اے وقت کہ تو ہم انسانوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے اور ہمیں اپنی بے بسی پر رونے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔

اس روز میں اپنے ایم ڈی کے ساتھ میٹنگ میں تھی کہ ایم ڈی کی میز پر دھرے انٹرکام کا بزر بجا۔ ایم ڈی نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"جی۔"

پھر دوسری طرف سے کہی جانے والی بات سنی اور آن کی آن ان کا چہرہ کھل اٹھا "فوراً بھیجئے مس ڈیوڈ۔" انہوں نے کہا۔

ایم ڈی صاحب ریسیور رکھتے ہوئے اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے مجھ سے کہا "مس حبیبہ! باقی بات بعد میں..... اس وقت میرے ایک بہت پرانے دوست آگئے ہیں کافی عرصے بعد۔"

"رائٹ سر!" میں کاغذات اور فائلیں سمیٹنے لگی۔

"آؤ..... آؤ جانِ عزیز! تمہارے ہی استقبال کو کھڑے ہیں ہم۔" میں نے ایم ڈی کو جو عموماً بہت تکلف برتا کرتے تھے' انتہائی بے تکلفی سے یہ کہتے اور اپنی میز کے پاس سے ہٹ کر دروازے کی سمت پیش قدمی کرتے دیکھا۔

میں سمجھ گئی کہ ان کا کوئی بہت ہی بے تکلف دوست تھا جو آیا تھا۔ پشت دروازے کی سمت ہونے کے باعث میں اب تک اسے دیکھ نہ پائی تھی۔

فائلیں سینے سے لگا کر میں دروازے کے رخ پلٹی تو میں نے ایم ڈی اور ان کے دوست کو باہم گرم جوشی سے بغل گیر پایا۔ ایم ڈی کا چہرہ دروازے کے رخ تھا اور ان کے دوست کا سمتِ معکوس میں میری جانب۔ میری نظر اس پر پڑی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

بلا مبالغہ وہ رافع ہی تھا!

میرا کلاس میٹ۔ جس نے کالج کے آخری دنوں میں مجھ سے کہا تھا "آپ اپنا فون نمبر دینا پسند کریں گی مجھے؟"

"کیوں؟"

"کبھی بات کرنا چاہوں تو آپ کا نمبر تو ہونا چاہیے نا میرے پاس۔"

"آپ اپنا نمبر دے دیں مجھے۔ میں خود کر لیا کروں گی۔"

اس نے مجھے اپنا نمبر دے دیا تھا مگر میں.....! میں ہنگامہ ہائے

زندگی میں ایسی ابھی کہ اسے فون کرنا تو درکنار خود کو بھی بھول گئی!

اب برسوں بعد وہ اچانک سامنے آیا تو میرے دل کی دھڑکنیں بے مہار ہو گئیں اور میں جہاں کی تہاں رہ گئی۔

اس نے مجھے دیکھا مگر اس کی نظروں میں شناسائی کی رمق بھر کیفیت بھی نظر نہ آئی۔

وہ اور ایم ڈی گرم جوش معانقے کے بعد الگ ہو چکے تھے اور ایم ڈی اسے اپنے ہمراہ لیے صوفے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں دم بخود اسے سکتے کی سی کیفیت میں دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت بدل گیا تھا۔ جب میں نے آخری مرتبہ اسے دیکھا تو وہ دبلا پتلا' اسمارٹ سا نوجوان تھا۔ اس کے بال سیاہ تھے اور وہ کلین شیو تھا۔ ان دنوں وہ عموماً جینز اور جیکٹ یا ٹی شرٹ میں ملبوس رہا کرتا تھا مگر اب وہ خاصا فربہ ہو چکا تھا۔ اس کے بال خاکستری تھے۔ چہرے پر موٹی موٹی مونچھیں تھیں' گھنی داڑھی اور آنکھوں پر سنہری کمانی کی عینک تھی۔ وہ بہترین ٹراپیکل سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے وجود سے اعلیٰ کلون کی مہک پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔

زمین آسمان کا تغیر آ چکا تھا اس کی شخصیت میں مگر میں اس انقلاب کے باوجود پہلی ہی نظر میں اسے پہچان گئی تھی۔

"کب آئے رافع؟" ایم ڈی صاحب نے اس سے پوچھا۔

اب کون کہہ سکتا تھا کہ اسے پہچاننے میں مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تھی!

صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے دوبارہ میری طرف دیکھا۔ اسی بے گانگی سے! نگاہوں میں اسی احساسِ اجنبیت کے ساتھ!

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا۔ ایم ڈی صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے "ٹھیک ہے مس حبیبہ۔" وہ غالباً یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں اب جا سکتی تھی۔

میں خفیف سی ہو گئی۔ میں نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے سے ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ دھرے اپنے گردوپیش پر طائرانہ نظر ڈال رہا تھا۔ میں نے دروازے کے بجائے صوفے کا رخ کیا اور اس کے نزدیک تھم کر کہا "آپ غالباً پہچانے نہیں مجھے۔"

وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا اور مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

آہ! وہ چند لمحے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں برزخ سے گزر رہی تھی۔

خدانخواستہ وہ مجھے پہچاننے سے انکار کر دیتا تو؟

میں نے اس کا فیصلہ سننے کے بجائے از خود کہا "میں حبیبہ ہوں۔۔۔۔ آپ کی کلاس میٹ۔"

"اوہ! آئی سی!" وہ ایک خواب آگیں سی کیفیت میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں پُر آس نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ جیسے وہی میرے جینے یا مرنے کا فیصلہ کر سکتا تھا!

"ہاؤ آر یو؟ کیسی ہیں آپ؟"

ایم ڈی صاحب قدرے استعجاب سے دیکھ رہے تھے۔

"فائن۔۔۔ تھینک یو۔" میں نے کہا۔

"ارے بھئی شکیل! یہ تو میری کلاس میٹ ہیں۔" اس نے مڑ کر میرے ایم ڈی کو بتایا۔

میں جی اٹھی۔ اس نے میری آس کا بھرم رکھ لیا تھا! وہ نہ پہچانتا تو میں مر ہی جاتی۔

"اور ہماری فیمرا اکاؤنٹس!" ایم ڈی صاحب نے میری بابت اسے بتایا۔

"بیٹھیے۔" اس نے مجھ سے کہا۔

میرے دل نے کہا "بیٹھ جا۔" مگر میں متکلف رہی۔ اس وقت میرے ایم ڈی کا دوست تھا وہ۔ سو میں نے کہا "تھینک یو۔۔۔۔ آپ لوگ بیٹھیں۔۔۔۔ ایم ڈی صاحب بتا رہے تھے کافی عرصے بعد آئے ہیں آپ۔"

"جی ہاں بہت عرصے بعد۔" اس نے تائید کی۔

"میں۔۔۔۔۔ میں بھی آپ سے ملنا ضرور چاہوں گی۔"

"ضرور۔۔۔ ضرور۔"

"دو کمرے چھوڑ کر تیسرا کمرا میرا ہے۔"

"رائٹ۔۔۔۔ رائٹ۔۔۔۔ رائٹ۔" اس کی نظریں میرے سر پر تھیں۔

"پلیز۔۔۔ بیٹھیے۔" میں نے کہا۔

وہ بیٹھ گیا۔ میں نے دروازے کا رخ کیا۔

دروازے سے نکلنے سے قبل میں نے پلٹ کر کہا "میں انتظار کروں گی۔"

"یہاں سے فارغ ہو کر حاضر ہوتا ہوں۔" اس نے کہا۔

دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے ایم ڈی کو کہتے سنا "ہاں جناب سنائیے۔"

O☆O

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے فائلیں میز پر رکھیں اور جھپاک سے باتھ روم میں گھس گئی۔ واش بیسن سے کچھ اوپر دیوار پر لگے آئینے پر سایہ فگن ٹیوب لائٹ آن کر کے میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ رافع نے مجھے کیسا پایا ہو گا۔

اف خدا! کیسی اجاڑ لگ رہی تھی میں!

واش بیسن پر اپنا دھڑ جھکاتے ہوئے میں اپنا چہرہ آئینے کے بہت نزدیک لے گئی اور میں نے چہرے کو دائیں بائیں گھماتے ہوئے مختلف زاویوں سے گہری ناقدانہ نظروں سے خود کو دیکھا۔

الٰہی توبہ! کیا حالت بنالی تھی میں نے اپنی!

ہر قسم کے تصنع سے محروم اپنا چہرہ دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہونے لگی۔ لپ اسٹک بھی صبح سے اب تک دو مرتبہ چائے پینے کے باعث تقریباً مٹ چکی تھی۔ میری نظر اپنے بالوں پر گئی تو میری کوفت اور شرمندگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

میرے اللہ! آگے سے کتنے زیادہ بال اڑ چکے تھے میرے اور بالوں کی سفید جڑیں کتنی بری لگ رہی تھیں۔ اس مرتبہ پھر کافی دن ہو گئے تھے مجھے ہیئر ڈائی کیے۔

اچھا تو رائٹ رائٹ کہتے ہوئے رافع کی نظریں میرے سر پر اس لیے جمی تھیں کہ وہ میرے بالوں میں اتری سفیدی دیکھ رہا تھا!

مجھے شدید کوفت اور شرمندگی نے آلیا۔ کیا سوچا ہوگا اس نے کہ..... کہ یہاں تو دھوپ چھاؤں کا سماں ہے۔ کہیں بال کالے ہیں کہیں سفید۔ سمجھ گیا ہوگا کہ ڈائی لگاتی ہے۔

میرا دل دکھنے لگا لیکن پھر مجھے اس خیال نے تقویت دی کہ اب اس کے اپنے بال بھی تو سیاہ نہ رہے تھے۔ خاکستری ہو گئے تھے۔

مگر خاکستری بالوں کے باوجود اس کی شخصیت کتنی شاندار لگ رہی تھی!

میں تیزی سے باتھ روم سے نکلی اور اپنی میز کی سائیڈ بورڈ سے اپنا بیگ نکال کر میں نے جلدی جلدی اسے ٹٹولا۔

کالج چھوڑنے کے بعد اور امی کی موت سے پہلے تک میرے بیگ میں ایک ننھی میک اپ کٹ ہمیشہ رہا کرتی تھی جس میں کنگھا، آئینہ، بلش آن، آئی پنسل، لپ پنسل، دو تین رنگوں کی لپ اسٹک موجود ہوتیں۔ ہنگامی استعمال کے لیے میں ایک آدھ پاکٹ سائز پرفیوم بھی بیگ میں ضرور رکھتی تھی۔ ابو جی لاکھ مجھے بیٹا کہا کرتے تھے مگر میں اپنی نسوانیت عزیز رکھتی تھی۔

مگر اب بہت ٹٹولنے پر کنگھا، ایک عدد لپ اسٹک اور عطر کی ایک شیشی ہی مل سکی! اس وقت یہ چیزیں بھی غنیمت لگیں۔

دوبارہ باتھ روم میں گھس کر میں نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا کہ اس سے کچھ اور نہ سہی چہرہ فریش تو ہو ہی جاتا۔ پھر میں نے بالوں میں کنگھا پھیرتے ہوئے سفید بالوں کو ممکنہ حد تک چھپانے کی کوشش کی مگر بالوں میں بکھری سفیدی کو میں خاطر خواہ نہ چھپا سکی۔

بعد ازاں میں نے اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہ جمائی جس سے میرے چہرے کی بے رونقی میں خاصا افاقہ ہوا اور میں آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اگر اس ہنگامی صورتِ حال میں میرے بیگ میں لپ اسٹک نہ ہوتی تو میں کیا کرتی۔

واقعی لپ اسٹک بھی اللہ تعالیٰ کی کیا نعمت ہے ہم عورتوں کے لیے! بیماری، بدحالی، سوگواری سارے دکھ درد چھپا لیتی ہے۔

کنگھا اور لپ اسٹک بڑی رازداری سے اپنے آنچل کی اوٹ میں چھپائے میں بڑی احتیاط سے باتھ روم سے نکلی۔ دونوں چیزوں کو بیگ میں رکھا۔ عطر کی شیشی سے تھوڑا سا عطر لگایا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر بظاہر کام میں مصروف ہو گئی مگر میرا دل رافع کا منتظر تھا اور میرے کان اس کی آہٹ پر لگے تھے!

خاصی دیر یہ کیفیت رہی کہ ہلکی سی آہٹ بھی مجھے چونکا دیتی اور میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں۔

شاید میں نے پون گھنٹا انتظار کیا یا شاید گھنٹا بھر مگر مجھے یوں لگا جیسے مجھے صدیوں منتظر رہنا پڑا تھا۔

طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد بالآخر وہ آ گیا۔

"حاضر ہو سکتا ہوں؟" اس نے میرے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

میں اس کے استقبال کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایم ڈی صاحب بھی اس کے ہمراہ تھے۔

"مس حبیبہ! آپ کے یہ کلاس میٹ ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔" ایم ڈی صاحب نے بڑے خوش گوار موڈ میں بتایا۔

میں دھیرے سے مسکرا دی۔

"اچھا جناب!" ایم ڈی نے رافع کا بازو دھیرے سے تھپتھپاتے ہوئے کہا "آپ لوگ تو اپنے کالج اور کالج میٹس کی باتیں کریں گے، مجھے اجازت۔"

رافع نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا "لیکن خیال رہے یہاں سے فارغ ہو کر دوبارہ میری طرف آ رہے ہو۔" ایم ڈی صاحب نے جتایا۔

"رائٹ!" رافع نے کہا۔

ایم ڈی صاحب کے جانے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

"بیٹھیے پلیز!" میں نے کہا۔

وہ میرے روبرو بیٹھ گیا۔ میں بھی بیٹھ رہی۔

"چائے پئیں گے یا کافی؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں.... ابھی شکیل کے ساتھ چائے پی کر آ رہا ہوں۔"

"شیور؟"

"او.... یس۔" اس کی نظریں میرے بالوں پر تھیں۔

میں کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگی۔ وہ میرے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

میں نے موقع غنیمت جان کر بہت آہستگی سے اپنے دوپٹے کا پلو سر پر لے لیا تاکہ وہ میرے بالوں میں بکھری سفیدی کو بار بار نہ دیکھنے پائے۔

"ہاں جناب۔" وہ کمرے کا جائزہ لے کر میری طرف متوجہ ہوا "کیسی ہیں آپ؟"

اس کے اس ایک سوال نے میرے دل میں طوفان مچا دیا۔ کیا بتاتی میں اسے کہ میں کیسی تھی اور کتنی اکیلی تھی!

مجھے کالج کا زمانہ یاد آنے لگا۔

زندگی کتنی دلنواز، نڈر اور بے فکری ہوا کرتی تھی ان دنوں! دل پر کسی صدمے کی چھاپ تھی نہ من میں کسی دکھ کی کسک۔ سر پر ابو جی کی شفقت کا سائبان تھا اور امی جان کی محبت کی چھایا۔ دل میں امنگیں تھیں۔ جسم میں ڈھیروں توانائی۔ صبح سے شام تک مصروفیت بھی مجھے تھکا نہ پاتی تھی۔

اب تو سرِ شام ہی منہ لپیٹ کر پڑ رہنے کو جی چاہتا تھا۔

ہائے! اے کاش کہ وقت وہیں تھم گیا ہوتا یا پھر پلٹ آتا!

"میں تو ٹھیک ہوں۔" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "آپ سنائیے۔"

"بائی دی وے، کتنے عرصے بعد ملے ہیں ہم؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

میں نے ایک گہری سانس کھینچی پھر کہا "تقریباً ستائیس اٹھائیس برس بعد۔"

"اوہ!" وہ منہ اوپر کر کے ہنس دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "خاصا لمبا عرصہ!"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم سوری میں آپ کو پہلی نظر میں بالکل نہیں پہچان سکا تھا۔"

"آپ تو دوسری نظر میں بھی نہیں پہچانے تھے۔" میں نے شاکی لہجے میں کہا۔

وہ قہقہہ مار کر یوں ہنسا جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

"آپ بدل بھی تو بہت گئیں مس...... سوری...... مسز......؟"

"مس حبیبہ۔"

"مس!" اس نے کچھ تعجب اور بے یقینی سے کہا۔

"ہاں۔"

وہ سنبھل بیٹھا "کیوں؟" اس نے پوچھا۔

میرے من میں جل تھل سی مچ گئی "بس" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی "خود اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں دی زندگی نے۔"

وہ ترحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے ساری زندگی سر اٹھا کر گزاری تھی۔ مجھے اس کی ترحم آمیز نگاہوں سے کوفت ہوئی۔

"بہرحال میں...... مطمئن ہوں۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

شاید میں نے غلط کہا بھی نہیں تھا۔ میں خوش تھی یا نہیں، مطمئن ضرور تھی۔ شاید اس لیے کہ میں جس کو جو دے سکتی تھی، میں نے فراخ دلی سے دیا تھا اور مجھے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

"رئیلی!" اس نے بے یقینی سے کہا۔

اس کی بے یقینی سے مجھے انوکھی تسکین ملی اور میں نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"آپ سنائیں...... ستائیس اٹھائیس برسوں میں آپ نے کیا کیا؟"

"شادی کی...... دو بچوں کا باپ بنا۔"

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبا لیا۔

"مگر پھر بھی آپ کی طرح اکیلا ہوں۔"

"کیوں؟"

"دو سال پہلے انیتا نے ڈیوورس لے لی۔"

"انیتا؟" میں نے چونک کر استفہامیہ لہجے میں کہا۔

"میری بیوی!"

"ایک انیتا ہماری کلاس میٹ بھی تو ہوا کرتی تھی۔"

"اسی سے ہوئی تھی میری شادی۔"

"اوہ نو!" مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"ہاں" اس نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"کیسے ہوئی اس سے آپ کی شادی؟"

"کیا مطلب؟"

"وہ تو شاید بی کام کے بعد اپنے پیرنٹس کے پاس نیروبی چلی گئی تھی۔"

"ہاں اور وہاں سے اس کی فیملی انگلینڈ چلی گئی تھی۔ انیتا کالج چھوڑنے کے بعد بھی مجھ سے کانٹیکٹ میں رہی۔ انگلینڈ جانے کے بعد اس نے اپنے پیرنٹس کی اجازت سے مجھے انگلینڈ آنے کی دعوت دی۔ میں وہاں گیا تو...... بس پھر ہماری شادی ہو گئی۔ دو بچے ہوئے ایک بیٹا، ایک بیٹی...... بیٹا کالج میں ہے۔ بیٹی فیشن ڈیزائننگ کا کورس کر رہی ہے...... دو سال پہلے انیتا کی ایک انڈین ڈاکٹر سے دوستی ہو گئی۔ میں نے روک ٹوک کی تو اس نے برا منایا اور میری سختی پر طلاق کا مطالبہ کر دیا...... میں نے طلاق دے دی۔"

کتنی بے ایمان اور مکار تھی انیتا! مجھے اپنی اور رافع کی شادی کی بھنک تک نہ دی اس نے۔ بے ایمانی تو رافع نے بھی کی تھی مگر قصوروار شاید میں تھی۔ رافع کو اپنا فون نمبر نہ دیا اور اس کا فون نمبر لے کر فون کرنا بھول گئی۔

"انیتا اب کہاں ہے؟"

"وہیں...... اسی ڈاکٹر کے پاس...... جو اب اس کا ہسبینڈ ہے۔"

"اور بچے؟"

"کبھی ماں کے پاس ہوتے ہیں، کبھی اپنے نانا نانی کے پاس اور کبھی اپنی علیحدہ دنیا میں۔"

"آپ کے پاس نہیں آتے؟"

"کبھی فون پر ہیلو ہائے کر لیتے تھے یا پیسوں کی ضرورت ہوتی تو آجاتے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ داستان تو اس کی بھی کچھ دل خوش کن نہ تھی۔

"آپ پاکستان کب آئے؟"

"دو ہفتے قبل۔"

"واپسی؟" میں نے اتنی حزم و احتیاط سے پوچھا جیسے اس کے جواب پر ہی میرے جینے یا مرنے کا انحصار تھا۔

"شاید اب واپس نہ جاؤں۔"

میرا دل کھل اٹھا۔

"میں اپنا کچھ بزنس کرنا چاہتا ہوں...... آج شکیل کے پاس اسی سلسلے میں صلاح و مشورہ کرنے آیا تھا۔"

"کس قسم کا بزنس؟"

"کوئی فیکٹری لگانا چاہتا ہوں۔۔۔ ارے ہاں' آپ کی اپنی بھی تو ایک فیکٹری تھی غالباً بینڈنس فیکٹری۔"

"جی ہاں۔" میں نے ایک سرد آہ کھینچی "مگر اب نہیں ہے۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"ابو جی کے انتقال کے بعد فروخت کر دی۔"

"آئی سی" اس نے پھر مجھے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

مجھے پھر کوفت ہوئی "اچھا ہی ہوا۔۔۔ میں اکیلی شاید اسے سنبھال بھی نہ سکتی۔" میں نے کہا۔

حالاں کہ فیکٹری فروخت ہونے کا مجھے جتنا صدمہ ہوا تھا اس کا اندازہ مجھی کو تھا۔

"آپ کا کیا مشورہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کس سلسلے میں؟" میں بے ساختہ چونکی۔

"فیکٹری لگانے کے سلسلے میں۔"

مجھے اپنی ذات بڑی اہم اور معتبر سی لگی۔ وہ مجھ سے مشورہ مانگ رہا تھا!

"سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ کس قسم کی فیکٹری لگانا چاہتے ہیں آپ؟"

"فرض کیجیے اس سوال کا جواب میں آپ سے چاہوں' آپ بھی تو خاصا تجربہ رکھتی ہیں اس سلسلے میں۔"

"صنعت کوئی بھی ہو' صارفین کو معیاری پروڈکٹ دیں' بہت آگے جائیں گے۔"

"گڈ!" اس نے توصیفی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا "آپ نے مجھے ایک اہم نکتہ تو سمجھا ہی دیا۔"

میں اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر جھینپ گئی۔

"ویسے ایک بات میں نے بھی سیکھی ہے اپنے تجربے سے۔"

میں اسے دیکھنے لگی۔

"زندگی ہو یا بزنس' مخلص پارٹنر کے بغیر بات نہیں بنتی۔" اس نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر بولا "میرا ساتھ دیں گی؟"

"جی!" میں نے بے ساختہ ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ میرے ہڑبڑانے پر مسکرا دیا پھر بولا "میرا مطلب ہے بزنس شروع کروں تو آپ میرا ہاتھ بٹائیں گی؟"

"جو مجھ سے ہو سکے گا' ضرور کروں گی۔"

"تھینک یو۔۔۔ تھینک یو ویری مچ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "اب اجازت چاہوں گا۔"

میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا۔ اس پر میرا نام' عہدہ اور دفتر کا فون نمبر درج تھے۔

میں نے جلدی سے اس پر اپنے گھر کا فون نمبر بھی لکھا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس پر میں نے گھر کا فون نمبر بھی لکھ دیا ہے۔"

"تھینک یو!" اس نے کارڈ لے کر اس پر ایک نظر ڈالی پھر جیب سے ایک چرمی بٹوا نکال کر کارڈ کو اس کی جیب میں رکھ لیا۔

وہ جانے کو اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ۔۔۔ آپ اپنا کانٹیکٹ نمبر دیں گے مجھے؟" میں اسے رخصت کرنے کو اٹھ گئی تھی۔

"آپ کو کانٹیکٹ نمبر دینا بے کار ہے۔" اس کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

"کیوں؟" مجھے اپنی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"ایک بار پہلے بھی تو لیا تھا آپ نے میرا کانٹیکٹ نمبر۔۔۔ میں آپ کی کال کا انتظار ہی کرتا رہا۔"

اوہ! تو گویا کسک اس کے دل میں بھی تھی۔ مجھے اپنی پلکوں کی جڑوں میں نمی کا احساس ہوا۔

"بہرحال اگر آپ چاہتی ہیں تو نوٹ کر لیجیے میرا نمبر۔"

"جی۔۔۔ لکھوائیے۔"

اس نے نمبر بتایا' میں نے لکھ لیا۔ کاغذ پر ہی نہیں' اپنے دل پر بھی!

"گھر وہی ہے' فون نمبر تبدیل ہو گیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"اس مرتبہ میں تمہیں فون کرنا نہیں بھولوں گی۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

میرے پاس یاد رکھنے کو کچھ اور رہ جو نہیں گیا تھا۔

جاتے جاتے وہ بولا "ایک آدھ روز میں شکیل کے پاس پھر آؤں گا۔ انشاءاللہ پھر ملاقات ہوگی آپ سے۔"

"او کے!"

وہ چلا گیا۔ اس کے وجود میں سے اٹھتی دلنواز مہک میرے کمرے میں رہ گئی۔

اس کے جاتے ہی میں دوبارہ باتھ روم میں گھس گئی اور میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہیں اسے کیسی لگی ہوں گی۔ دوپٹے کا پلو میں نے جوں کا توں اپنے سر پر رہنے دیا۔ آئینے میں مجھے دوپٹے کے پلو کی اوٹ سے چند سفید بال جھانکتے دکھائی دیے!

O☆O
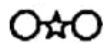
رافع کو ایک آدھ روز میں پھر ایم ڈی صاحب کے پاس آنا تھا۔ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اگلے ہی دن آ جاتا۔

اس شام دفتر سے گھر واپس لوٹتے ہوئے میں بہت دنوں بعد اپنی بیوٹیشن کے پارلر گئی۔

میں نے بالوں کی ضروری تراش خراش کروائی۔ بھویں بنوائیں۔ فیشل لیا۔ ماسک لگوایا۔ کاسمیٹکس کے سلسلے میں بیوٹیشن سے ضروری مشورہ لیا۔

راستے میں ایک شاپنگ سینٹر سے اپنے لیے فاؤنڈیشن اور لپ اسٹک کے وہ شیڈز خریدے جو میری بیوٹیشن نے تجویز کیے تھے۔

گھر واپسی کے بعد میں نے بہت اہتمام سے اپنے بال ڈائی

کیے۔
بالوں کو ڈائی لگانے کے بعد میں خاصی دیر تک اپنے ہاتھوں اور پیروں کے ناخنوں کی تراش خراش میں مصروف رہی پھر شاور لینے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی۔
نہا دھو کر بال سکھانے کے بعد میں بال سلجھانے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل کے روبرو بیٹھی تو مجھے اپنے بالوں کی رنگت دیکھ کر اطمینان ہوا۔ سفید بال سیاہ ہوگئے تھے۔ بس اب ہیئر اسٹائل ایسا بنانا تھا کہ پیشانی سے اوپر بالوں کا چھدرا پن چھپ جاتا جو طویل عرصے تک ہیئر ڈائی کے استعمال نے پیدا کردیا تھا۔
کافی دیر تک میں بالوں کو الٹ پلٹ کر وضع وضع کے ہیئر اسٹائل بنا کر دیکھتی رہی۔ بالآخر ایک پر دل ٹھہر ہی گیا۔
پھر میں نے لپ اسٹک کے مختلف شیڈز اپنے ہونٹوں پر باری باری لگا کر دیکھے کہ کون سا زیادہ بھلا لگ رہا تھا۔
میں نے بہت عرصے بعد ناخنوں پر کیوٹیکس بھی لگائی۔
پھر میں بہت دیر وارڈروب کھولے اپنے لیے کل، پرسوں اور ترسوں کے لیے کپڑوں کے انتخاب میں غلطاں رہی۔
یادگار ڈیوٹی کے بعد اسپتال سے گھر لوٹی تو مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑی۔
"اللہ خالہ جانی! آج تو آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" اس نے میرے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔
میں شرما گئی اور میں نے اس سے نظریں چرالیں۔
"کہیں جانے کی تیاری ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں..... بھلا یہ کوئی وقت ہے جانے کا۔"
"میں سمجھی شاید کسی تقریب میں انوائیٹڈ ہوں آپ..... شادی وغیرہ تو عموماً رات ہی کو ہوتی ہے خالہ جانی۔"
"میری جان! کہیں نہیں جارہی ہوں میں۔" میں پیار سے اس کا گال چھوتے ہوئے مسکرائی۔
"آج آپ خوش بھی بہت نظر آرہی ہیں خالہ جانی۔"
"اچھا!" میں دھیرے سے ہنسی۔
اپنی ہنسی مجھے مترنم سی لگی۔
"کوئی خاص بات خالہ جانی؟" اس نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا۔
"نہیں.... نہیں تو۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔
"آپ اور ماما مجھے بتائے بغیر کچھ گڑبڑ مت کیجئے گا۔"
"کیسی گڑبڑ؟" میں نے چونک کر کہا۔
"میرا مطلب ہے میری مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں ہونا چاہیے۔"
تو وہ میرے ظاہری اہتمام اور خوشی کو اپنی شادی کے معاملے سے منسوب کررہی تھی! اچھا تھا! بہت اچھا تھا! میں فی الحال اسے بلکہ اسے کیا کسی کو بھی کچھ نہ بتانا چاہتی تھی۔
"تم فکر مت کرو گڑیا رانی! تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے اسے اطمینان دلایا۔
"تھینک یو خالہ جانی!"

○☆○

اگلی صبح میں دفتر جانے کے لیے خاصے اہتمام سے تیار ہوئی۔
بہت دنوں بعد میں نے شوخ رنگ کپڑے پہنے، بالوں کو اس انداز سے آراستہ کیا کہ میری پیشانی سے اوپر بالوں کا انتہائی چھدرا پن چھپ جائے۔ بہت عرصے بعد میں نے فل میک اپ بھی کیا۔
دفتر جاتے ہوئے راستے میں، میں گاڑی میں لگے کیسٹ پلیئر پر طربیہ گیت سنتی رہی اور میری انگلیاں اسٹیئرنگ وھیل پر رقصاں رہیں۔ شاید میں کیسٹ کے ساتھ ساتھ خود بھی گنگناتی رہی تھی۔
بہت خوش تھی میں! زمین، آسمان، پرندے، ٹریفک کا شور، سڑکوں پر چلتے پھرتے لوگ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔
کسی نے سچ کہا ہے کہ سارے موسم ہمارے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ میرے من میں غنچۂ بہار چٹک چکا تھا!
امی کی موت کے بعد پہلی بار میرا موڈ اتنا خوش گوار تھا۔
دفتر پہنچی تو میرے معاونِ کار اور دستِ راست اعجاز احمد نے کہا "ماشاء اللہ میڈم صاحب! آج آپ بہت عرصے بعد پہلے کی طرح آفس آئی ہیں۔"
میں مسکرادی۔
"میڈم! آپ آج بہت فریش لگ رہی ہیں۔" اسٹینو ٹائپسٹ تبسم نے کہا۔
"صرف فریش!" میں نے مسکراتے ہوئے تیکھی نگاہوں سے تبسم کی طرف دیکھا۔
وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی "اچھی بھی میڈم۔"
"یہ ہوئی نا بات۔"
"میڈم! آج آپ خوش بھی بہت ہیں..... لگتا ہے یادگار بی بی کے بارے میں کوئی خوش خبری سننے والے ہیں جلد ہی ہم لوگ۔"
یادگار میرے دفتر بالخصوص میرے شعبے کے لئے اجنبی نہ تھی۔ بارہا آچکی تھی وہ میرے دفتر اور میرے ناتے سب اسے اہمیت دیتے تھے۔
"کیوں میڈم جی! میرا اندازہ درست ہے نا؟" تبسم نے پوچھا۔
میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اپنی خوشی کا اصل سبب تو بتانے سے رہی تھی میں ان لوگوں کو۔
"بہت پیاری بچی ہے یادگار۔" اعجاز احمد بولے۔
"ہماری میڈم تو کبھی یادگار سے بھی پیاری رہی ہوں گی اعجاز صاحب۔" تبسم نے لحظہ بھر کو توقف کیا پھر بولیں "دیکھیے آج بھی کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔"
تبسم کی بات نے میرا دل خوش کردیا۔ جیتی رہو! جیتی رہو تبسم!
اب میں اس اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اپنی سیٹ پر متمکن

ہو سکتی تھی کہ میں اچھی لگ رہی تھی۔ رافع چاہے تو آج ہی آسکتا تھا' میں اس کے استقبال کو تیار تھی۔

گو وہ ایک آدھ روز میں آنے کو کہہ گیا تھا مگر میرے دل میں انتظار کا موسم تو اس کے جاتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ اوہ! کس صبر آزما کیفیت کا نام ہے انتظار! ہر آہٹ پر میں چونک پڑتی۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔

میں دو تین مرتبہ باتھ روم میں گئی اور میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور باتھ روم سے نکلنے کے بعد ہر مرتبہ اپنے آپ کو سمجھایا کہ وہ ایک آدھ روز میں آنے کو کہہ گیا تھا' ضروری نہیں کہ آج ہی آجائے مگر جوں ہی ذرا سی فرصت اور مہلت ملتی' میرے قدم آپ ہی آپ باتھ روم کی طرف اٹھ جاتے۔ میں اپنی نوک پلک سنوارتی پھر سیٹ پر آبیٹھتی۔ ایک عجیب سی اضطراری کیفیت طاری تھی مجھ پر۔

کل اس نے مجھے جس حلیے میں دیکھا' سو دیکھا اب میں اسے سراپا آراستہ و پیراستہ دکھائی دینا چاہتی تھی۔

میرے دل کی لگی یار آور ثابت ہوئی! وہ اسی دن آگیا۔ لنچ بریک کے بعد!

خدا کا شکر کہ میں نے لنچ کے بعد اپنی نوک پلک از سر نو سنواری تھی اور "بیوٹی فل" کا ہلکا سا اسپرے بھی کر لیا تھا اپنے سراپا پر۔ یہ پرفیوم شگفتہ نے کچھ دن پہلے ہی مجھے اپنی کسی شناسا کے ذریعے بھجوائی تھی جو میں اس روز اپنے بیگ میں ڈال کر دفتر لے آئی تھی۔

وہ آیا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

کل کی طرح آج بھی ایم ڈی صاحب اس کے ہمراہ تھے۔ میں ان کے احترام میں کھڑی ہو گئی۔

اوہ! صبح سے میں ایم ڈی صاحب کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں ان کی طرف سے مجھے خدشہ تھا کہ وہ میری آراستگی کا سبب تاڑ لیں گے۔

بالآخر ان کا سامنا ہو ہی گیا!

مجھے بنا سنورا دیکھ کر ان کی نگاہوں میں ایک معنی خیز کیفیت لہرائی۔ میں نے نظریں چرا لیں۔

"مس حبیبہ!" ایم ڈی صاحب نے مجھے مخاطب کیا اور رافع کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "یہ حضرت آپ کو ہائی جیک کرنا چاہتے ہیں۔"

"جی!" میں نے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا۔

"گھبرایئے مت!" ایم ڈی صاحب مسکرائے "موصوف فیکٹری لگانا چاہتے ہیں اور آپ کے تجربے کو کام میں لا کر بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔"

میں چپ رہی۔

"پلیز بیٹھیے۔" ایم ڈی صاحب بولے۔

میں' ایم ڈی صاحب اور رافع تینوں بیٹھ گئے۔

"رافع کا خیال ہے کہ آپ چوں کہ خود ایک پینٹس فیکٹری چلا چکی ہیں اس لیے آپ ان کی خاطر خواہ رہنمائی اور مدد کر سکیں گی پینٹس فیکٹری لگانے میں۔" ایم ڈی صاحب بولے۔

"مجھ سے جو ہو سکے گا' میں ضرور کروں گی سر!" میں نے کہا۔

"لیکن ہمارا اکاؤنٹس ڈپارٹ کون سنبھالے گا؟"

"میں۔۔۔ میں سر!"

"بیک وقت دو محاذوں پر کیوں کر لڑ سکیں گی آپ؟" ایم ڈی صاحب مسکرائے۔

"سر! مجھے ایک وقت میں کئی کئی محاذوں پر لڑنا آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"آں ہاں۔" ایم ڈی صاحب نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ تو نہ تھا۔ زندگی میں بارہا میں بیک وقت کئی کئی محاذوں پر لڑی تھی۔

میرا جی چاہا' پھوٹ پھوٹ کر رو دوں مگر میں نے خود پر قابو رکھا۔

"اوکے۔۔۔ آپ دونوں گفتگو فرمائیں' میں چلتا ہوں۔" ایم ڈی صاحب جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے رافع سے پوچھا "چائے پئیں گے؟"

"ہاں۔۔۔ آج تو ضرور پیوں گا۔" اس نے کہا۔

میں نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو طلب کیا اور چائے لانے کو کہا۔

"آج آپ کل سے بہت مختلف نظر آرہی ہیں۔" وہ بولا۔

"کیا مختلف نظر آرہی ہوں؟" میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لینے کی کوشش کی۔

وہ دھیرے سے مسکرادیا پھر بولا "اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے لیکن۔۔۔۔۔"

"لیکن؟"

"کوئی بات ہے ضرور جو آج آپ کو کل سے بہت مختلف ظاہر کر رہی ہے۔" اس کی نظریں میرے بالوں پر تھیں۔

میں نے کل کی طرح سر پر دوپٹے کا پلو لینے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ کل کی نسبت آج میں بہت پُراعتماد تھی۔

لپ اسٹک کی طرح ہیئر ڈائی بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت سمجھتی تھی میں۔ لپ اسٹک اگر ہر دکھ درد' بیماری آزاری پر پردہ ڈال دیتی تو ہیئر ڈائی بڑی راز داری سے عمر کے کئی سال گھٹا دیتا۔

صبح آئینہ مجھے بتا چکا تھا کہ ہیئر ڈائی کے استعمال نے میری اصل عمر چھپا دی تھی اور کاسمیٹکس کے استعمال نے ان میں مزید تخفیف کر دی تھی۔

"اچھا جناب!" وہ سنبھل کر بیٹھ گیا جیسے کوئی خاص بات کرنے والا ہو "میں نے پینٹس فیکٹری لگانے کا فیصلہ تو کر لیا ہے۔"

"ایک ہی دن میں!" میں نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"ایک ہی دن میں! کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کل تک تو آپ کے پاس کوئی یقینی پروگرام نہیں تھا۔۔۔ بس آپ فیکٹری لگانے کی بات کر رہے تھے۔"

"پتا ہے کیا" وہ مجھے بڑی معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "کل آپ سے مل کر جانے کے بعد میں تمام وقت آپ ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔"

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور میں اپنے چہرے پر تمازت سی محسوس کرنے لگی۔

"مجھے یقین تھا۔" میں نے اترا کر دل ہی دل میں سوچا "مجھے یقین تھا کہ تم میرے بارے میں ضرور سوچو گے۔"

بجا کہ میں اڑتالیس برس کی ہو چکی تھی اور یہ بھی تسلیم کہ امی جان کی موت کے بعد میں اپنی طرف سے بہت غافل ہو گئی تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ اب بھی اپنے آپ پر توجہ دے کر میں لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ میں اب بھی سرو قامت تھی۔ میرا جسم ہنوز چھریرا تھا۔ بال رنگ کر جوانوں کے بالوں سے زیادہ سیاہ دکھائی دینے لگتے۔ کاسمیٹکس استعمال کر کے میں اپنی اصل عمر سے کئی سال کم نظر آنے لگتی تھی۔ رہا میرا دل تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا! کل رافع سے ملنے سے پہلے میرا دل مایوس اور محزون تھا مگر اس سے ملنے کے بعد وہ کسی الہڑ دوشیزہ کا پُر امنگ دل بن گیا تھا۔

کل سے مجھے دنیا بہت دل فریب لگ رہی تھی۔

"میں نے سوچا ہے کہ۔۔۔۔۔"

کہ! میری سانس جہاں کی تہاں رہ گئی۔ میرا دل گویا اس کا ہر ہر لفظ بہت حزم و احتیاط سے سننے کو تھم گیا۔

"آپ کے کاروباری تجربے سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے وہی کام کیوں نہ کیا جائے جس میں آپ کو عملی تجربہ ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے پینٹس فیکٹری ہی کیوں نہ لگائی جائے۔"

میں نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"آج شکیل سے بھی بات ہوئی تو اس نے بھی تائید کی۔"

میں سنتی رہی۔ وہ غالباً میری اصل کیفیت سے قطعاً بے خبر تھا۔

"کیا خیال ہے؟"

"آ۔۔۔ آپ کی مرضی۔۔۔۔۔ لگالیں۔۔۔۔ پینٹس فیکٹری ہی لگالیں۔"

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ کیا بے دھیانی میں کوئی غلط بات نکل گئی تھی میرے منہ سے!

اس نے اپنا دایاں ہاتھ پسارا اور مسکراتے ہوئے بولا "آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے فیکٹری اس ہتھیلی پر کھڑی ہو جائے گی۔"

اس نے توقف کیا پھر کامل سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا "ابھی تو سوچ بچار اور صلاح مشورے کا مرحلہ ہے۔۔۔۔ کام فائدہ بخش تو ہے نا؟"

"بالکل ہے۔"

"اور بارہ مہینے چلنے والا بھی ہے۔"

"جی!"

"لیکن آپ کو پہلے قدم سے میرے ساتھ رہنا ہوگا۔"

"جی۔۔۔۔ ضرور۔"

"وعدہ؟" اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینا ہی چاہتی تھی کہ چپراسی چائے لے آیا۔

اس نے ہاتھ پرے ہٹالیا اور معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

چائے کے دوران وہ بولا "شکیل نے فیکٹری کے لیے ایک پلاٹ بتایا ہے۔ کل وہ دیکھنے جا رہا ہوں، آپ چلیں گی؟"

"میرا چلنا ضروری ہے؟" میں نے کچھ اس طور کہا جیسے میں اسے آزمانا اور اپنی اہمیت کا اندازہ کرنا چاہتی تھی۔

"بالکل ضروری ہے۔" اس نے کہا پھر مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "یاد رہے، آپ پہلے قدم سے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکی ہیں۔"

"پہلا قدم! وہ تو تم نہ جانے کب کا اٹھا چکے۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

انیتا! او انیتا! تم تو لومڑی کی طرح عیار نکلیں!

میرے جبڑے آپ ہی آپ بھنچ گئے۔

مجھے انگریزی کی ایک "ورس" یاد آنے لگی جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ اگر تم کسی چیز کو اپنانے کی خواہش رکھتے ہو تو اسے زبردستی قابو کرنے کی کوشش مت کرو۔ اسے چھوڑ دو، جانے دو۔ اگر وہ تمہاری ہے تو واپس آجائے گی اور اگر واپس نہ آئے تو سمجھ لو کہ وہ کبھی تمہاری تھی ہی نہیں۔

رافع واپس آگیا تھا! کتنی بے ایمان تھیں تم انیتا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ رافع اور میں۔۔۔۔۔

خیر جانے دو۔۔۔۔ میری چیز تمہاری بددیانتی کے باوجود میرے پاس واپس آچکی تھی!

O☆O

ایم ڈی صاحب نے رافع کو جو پلاٹ دکھایا، بہت موقع کی جگہ پر تھا۔

میں بھی ان دونوں کے ہمراہ تھی۔ رافع نے پوچھا "کیسا ہے؟"

میں نے کہا "فرسٹ کلاس۔"

ایم ڈی صاحب رافع سے بولے "ایسی موقع کی جگہ اب شاید اس پورے انڈسٹریل ایریا میں کہیں اور نہ ملے اور قیمت بھی انتہائی مناسب ہے۔"

"پراپرٹی ڈیلر سے کہو، پہلی فرصت میں یہ ڈیل کرائے۔" رافع نے کہا۔

"فیکٹری چل کر فون پر بات کرتے ہیں اس سے۔" ایم ڈی صاحب بولے۔

دو روز بعد رافع نے پلاٹ کے مالک کو پراپرٹی ڈیلر کے توسط

سے بیعانہ دے دیا اور ضروری کاغذات تیار ہونے لگے۔

میں بہت خوش تھی۔ رافع سے روزانہ ملاقات ہو رہی تھی اور چند ہی دن میں میری کایا کلپ ہو گئی تھی۔ میں اچھے کپڑے پہنتی۔ انتہائی اہتمام سے تیار ہوتی۔ طربیہ موسیقی سنتی۔ بات بات پر ہنستی اور یادگار سے ہنسی مذاق کرتی۔

ایک روز یادگار بولی "خالہ جانی! میں خوش ہوں کہ آپ پھر پہلے جیسی ہو گئی ہیں۔"

"کیسی بھلا؟"

"اسمارٹ، جولی اینڈ......"

"اینڈ؟"

"ینگ!"

میں کھلکھلا کر ہنس دی۔ یادگار کی بات نے میرے دل کو کنول کی طرح کھلا دیا تھا۔ اس نے مجھے اسمارٹ، ہنس مکھ اور جوان کہا تھا۔

میرے لیے اس کی آخری بات سب سے زیادہ دل خوش کن تھی تاہم میں نے اس کے بیان کی مزید تصدیق کے لیے بڑے لاابالی انداز میں کہا "ینگ! ارے میری جان! کیوں خالہ جانی کا مذاق اڑاتی ہو...... خالہ جانی ینگ کہاں رہی اب تو بڑھاپا آگیا ہے۔"

یادگار قہقہہ مار کر ہنس دی پھر بولی "بڑھاپا! اوہ خالہ جانی! اس گریس فل بڑھاپے پر تو ہزار جوانیاں قربان...... اگر بڑھاپا اتنا حسین ہوتا ہے تو میں تو بہت شوق سے لوں گی اسے۔"

یادگار کی اس بات نے مجھے گھٹی گھٹی ایک سرد آہ کھینچنے پر مجبور کر دیا۔ کتنی عجیب بات تھی! دوسروں کے بڑھاپے کو کبھی میں بھی اسی طرح رشک سے دیکھا کرتی تھی!

ہم دونوں خالہ بھانجی باتیں کر ہی رہی تھیں کہ ہماری نوجوان ملازمہ بتولن آ پہنچی۔ امی جان کے انتقال کے بعد ہمارے دیرینہ ملازم خوشنود بابا اپنی بیٹی بتولن کو بھی ساتھ لے آئے تھے۔ باپ بیٹی گھر کے کام کاج کرتے اور گھر کے لوگوں کی طرح گھر میں رہتے۔ ساری لڑکیوں کی طرح بتولن کو بھی اچھے کپڑے پہننے اور بننے سنورنے کا شوق تھا۔ جب سے وہ ہمارے پاس آئی تھی اس کے اپنے کہنے کے مطابق اس کے عیش ہو گئے تھے۔ میرے اور یادگار کے پرانے کپڑے، جوتے، کاسمیٹکس اور استعمال کی دوسری اشیا اسی کے حصے میں جاتیں۔

بتولن کو دیکھ کر یادگار نے کہا "ذرا دیکھو بتولن! خالہ جانی پر بڑھاپا آیا معلوم ہوتا ہے کہیں۔"

"نہ جی نہ، توبہ کریں۔" بتولن بولی پھر اس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر یادگار سے کہا "میں اور بابا تو دعائیں مانگتیں ہیں کہ کوئی مقدر کا بھلا آئے اور بڑی بی بی کا مقدر بھی کھل جائے۔"

"ہائیں!" میں نے بتولن کو آنکھیں دکھائیں۔

"چھوٹی بی بی، کتنا مزہ آئے نا جی اگر بڑی بی بی کی شادی بھی ہو جائے۔" بتولن نے میری آنکھوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

"بتولن!" میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"پلیز خالہ جانی! مت ڈانٹیے اسے۔ وہ میرے دل کی بات کہہ رہی ہے۔" یادگار نے کہا۔

"یو ناٹی گرل!" میں نے یادگار کو پیار سے گھورا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

O☆O

پلاٹ کا سودا بڑا سودا تھا۔

بیعانے کی ادائیگی کے بعد رافع کے وکیل نے اطلاعِ عام کا اشتہار اخبار میں دیا کہ میرے مؤکل نے فلاں انڈسٹریل پلاٹ موجودہ مالک سے خریدنے کا معاہدہ کیا ہے۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض ہو تو سات یوم کے اندر مطلع کرے۔ بصورتِ دیگر سودے کی تکمیل کرلی جائے گی اور کوئی دعویٰ قابلِ قبول نہ ہوگا۔

اس نوٹس کے جواب میں ایک نہیں، پلاٹ کے دو دعوے دار نکل آئے۔

اس دعوے نے رافع کو پریشان کر دیا۔

"میں تو سمجھا تھا یہاں حالات بہتر ہو گئے ہوں گے مگر......" وہ بہت جھنجلایا ہوا تھا۔

خوش قسمتی سے ایم ڈی صاحب کا دوست ہونے کی وجہ سے فیکٹری میں اور میرے پاس اس کی آمد و رفت کو غلط معنی نہ پہنائے جا رہے تھے۔

"آپ اتنے بددل نہ ہوں۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"وقت بھی ضائع ہوا اور پیپر ورک بھی۔" وہ بڑبڑایا۔

"کسی بڑی پریشانی سے یہ تھوڑی سی پریشانی بہتر ہے۔" میں نے کہا۔

"اسے آپ تھوڑی سی پریشانی کہہ رہی ہیں...... تقریباً دو ہفتے ضائع ہو گئے۔"

"آپ دو ہفتوں کی بات کرتے ہیں، یہاں تو کبھی کبھی پوری پوری عمر ضائع ہو جاتی ہے۔"

"گاڈ!" اس نے سر جھٹکا۔

"ریلیکس!" میں نے کہا۔

"کین آئی؟" وہ بولا "میں تو اپ سیٹ ہو گیا ہوں۔"

"اپ سیٹ نہ ہوں۔ یہاں آپ کو ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔"

"میں انگلینڈ واپس جانا زیادہ بہتر سمجھوں گا۔"

"اوہ نو!" میرا دل چلّایا۔

"ٹوکن منی کا کیا بنا؟" میں نے پوچھا۔

"پراپرٹی ڈیلر نے ٹوکن منی تو واپس دلوانے کا وعدہ کیا ہے۔"

"تو پھر اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

"وقت کے زیاں سے بڑا نقصان بھی کوئی اور ہو سکتا ہے۔۔۔ ٹائم از منی۔"
مجھے اس کی واپسی کے ذکر نے ہراساں کر دیا تھا۔
"چائے پئیں گے؟"
"نو۔۔۔ تھینک یو۔"
"کسی پراپرٹی ڈیلر کے پاس چلیں؟"
"کیوں؟"
"پوچھتے ہیں' کوئی اور موقع کا پلاٹ ہے انڈسٹریل ایریا میں۔"
"فی الحال تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا میرے۔"
میری بھی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ اسے کیوں کر بہلاؤں۔۔۔ کیسے اس کی پریشانی رفع کروں۔ مجھے خوف تھا کہ خدا نخواستہ وہ بد دل ہو کر کہیں بیچ بیچ واپسی کے لیے رختِ سفر نہ باندھ لے۔
"آج شام آپ کی کیا مصروفیت ہے؟"
"کچھ نہیں۔"
"گڈ! تو ایسا کریں شام کو غریب خانے پر آجائیں۔۔۔ رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیں۔۔۔ میرے اور یادگار کے ساتھ۔"
"یادگار!"
"میری بھانجی ہے۔۔۔ مجھ سے بڑی بہن شادی کے کچھ ہی عرصے بعد بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کے شوہر کے انتقال کے بعد بیٹی پیدا ہوئی تو اس کے دادا نے کہا' یہ ہمارے بیٹے کی یادگار ہے اور اس کا نام یادگار ہی رکھ دیا۔۔۔ حالاں کہ بعد میں بیٹے کی جائداد کے لالچ میں وہ اس جیتی جاگتی یادگار کو بھول گئے۔۔۔۔ پھر بعد میں ہم لوگوں نے بہن کو دوسری شادی کے لیے مجبور کر دیا۔۔۔ یادگار ہمارے پاس رہی۔۔۔ اب تو ماشاءاللہ ڈاکٹر ہے۔"
"تو گویا ایک یہ محاذ بھی تھا جس پر آپ کو لڑنا پڑا۔" وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
مجھے یوں لگا جیسے میں اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو گئی تھی! "یادگار کو اس کے پیروں پر کھڑا کرنا میری زندگی کا شاید سب سے بڑا مقصد تھا۔"
اس نے مجھے ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔
"تو پھر شام کو آرہے ہیں نا آپ؟ یادگار سے مل کر آپ یقیناً خوش ہوں گے۔۔۔ بڑی پیاری لڑکی ہے۔"
"کھانے کا تکلف مت کیجئے گا۔"
"تکلف کیسا' جو گھر میں موجود ہو گا وہ حاضر کر دیں گے۔"
"اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے' ذرا ایڈریس تو سمجھائیے مجھے اپنے گھر کا۔" میں اسے اپنے گھر کا پتا سمجھانے لگی۔

○☆○

رافع کے جانے کے بعد میں نے گھر فون کیا۔ یادگار کا اس دن ڈے آف تھا اور وہ حسبِ معمول چھٹی کا دن اپنی ماما اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزارنے گئی ہوئی تھی۔ اسے شام کو گھر واپس آنا تھا۔ میں نے خوشنود بابا کو رات کے کھانے اور بتولن کو گھر کی صفائی ستھرائی کی بابت ضروری ہدایات دیں اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔
اس روز میں معمول سے کچھ پہلے ہی دفتر سے گھر جانے کو اٹھ لی۔
یادگار شام کو گھر لوٹی تو میں اور بتولن کچن میں مصروفِ کار تھے اور کچن میں خاصی اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔
"ہیلو! ہیلو! ہیلو! کسی کی دعوت ہے کیا جو اتنے مزے مزے کی خوشبوئیں آرہی ہیں۔" یادگار نے کچن میں جھانکتے ہوئے گہری سانس کھینچ کر کہا۔
"ہاں جی!" مجھ سے پہلے ہی بتولن نے کہا۔
"کون ہے خالہ جانی؟" یادگار نے چونک کر مجھ سے پوچھا۔
"ایک مہمان!"
"کچھ اتا پتا تو بتائیے۔"
"میرے ایک کلاس میٹ!"
"آپ کے ایک کلاس میٹ!" یادگار کو اچنبھا ہوا۔
"تمہیں شاید حیرانی ہوئی کہ اسٹون ایج کی خالہ جانی کے کلاس میٹ کس غار سے نکل آئے۔" میں نے یادگار کو متعجب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
"اوہ نو خالہ جانی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ!" اس نے خفیف ہو کر میرے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا "آپ اپنی عمر کے بارے میں خواہ مخواہ اتنی کانشس کیوں ہیں!"
"رافع صاحب کالج کے زمانے میں میرے کلاس میٹ ہوا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے' مستقبل قریب میں میرے باس بھی بن جائیں۔" میں نے ٹرائفل پر جیلی کی تہ لگاتے ہوئے کہا۔
"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر پوچھا۔
"رافع صاحب عرصۂ دراز بعد انگلینڈ سے واپس لوٹے ہیں اور اب یہاں پینٹس فیکٹری لگانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ میں ان کے لیے کام کروں۔ فیکٹری کے لیے ایک پلاٹ خرید رہے تھے بے چارے لیکن معلوم ہوا کہ اس پلاٹ پر تو دو افراد ملکیت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔"
"اچھا!"
"ہاں۔۔۔ بے چارے اس واقعے سے بہت مایوس تھے۔ میں نے کھانے پر انوائیٹ کر لیا کہ شاید اچھا کھانا کھا کر مایوسی کچھ کم ہو جائے۔"
"ایک بات پوچھوں خالہ جانی؟" یادگار کے لہجے میں انتہائی حزم و احتیاط تھی۔
"ہاں۔"
"کیا۔۔۔ کیا وہ۔۔۔ میرڈ ہیں؟" یادگار کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔
"ہاں۔ ہاں۔" میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "ہماری ہی ایک کلاس میٹ سے شادی کی تھی انہوں نے۔۔۔ دو بچے بھی

ہیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔"

"آئی سی!" یادگار کی آنکھوں میں ناچتی معنی خیزی رفوچکر ہوگئی۔

میں ٹرائفل کی ڈش فریج میں رکھ کر پلٹی۔

"خالہ جانی! ان کی مسز اور بچے بھی انوائیٹڈ ہیں کیا؟" اس کے لہجے میں استفسار کم یقین زیادہ تھا۔

"نہیں ۔۔۔ بے چارے کی بیوی سے بن نہیں سکی۔ دو سال پہلے طلاق ہوگئی۔"

"گڈ!" یادگار نے بے ساختہ چہک کر کہا۔

"بری بات" میں نے یادگار سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "کسی کا گھر ٹوٹنے کی خبر سن کر خوش نہیں ہوتے۔"

"خالہ جانی!" وہ پھر چہک کر بولی "گھر ٹوٹ کر ہی تو نئے بنتے ہیں۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکا۔

"کیا مطلب؟" میں نے تجاہلِ عارفانہ سے یادگار کو گھورا۔

"کچھ نہیں ۔۔۔ کچھ نہیں خالہ جانی۔" وہ میری نگاہوں کی تاب نہ لا کر سٹپٹا گئی۔

بتولن جو ہماری باتیں سن رہی تھی' بڑی سادہ لوحی سے بولی۔

"ہاں جی ہماری گلی میں چاچا خیرو کا مکان ڈھے گیا تھا بارش میں۔ جب چاچا اور چاچی نے اور ان کے بچوں نے مل کر نیا گھر کھڑا کیا تو چاچا خیرو نے بھی یہی بات کہی تھی جو ابھی یادگار بی بی نے کہی ہے۔"

"کون سی بات؟" میں نے پوچھا۔

"کہ گھر ٹوٹ کر ہی تو نئے بنتے ہیں۔"

میں نے اور یادگار نے ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھا اور نظریں باہم ملنے پر ہم دونوں ہی مسکرا دیے۔

"بچے جی! جاؤ جلدی سے تیار ہوجاؤ۔" میں نے یادگار سے کہا۔

"تیار ہوجاؤں!" یادگار نے سر جھکا کر سینے سے پاؤں تک اپنا جائزہ لیتے ہوئے قدرے تعجب سے کہا۔

"ہاں۔"

"خالہ جانی! ٹھیک ٹھاک تو ہیں میرے کپڑے۔"

"چہرے سے تو تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بھی بدل لو گی تو گھر آنے والے مہمان کے دل میں یہ خیال نہیں آئے گا کہ کیسی تھکی ہوئی ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی!" میں نے خوشگوار ۔۔۔ لہجے میں کہا۔

"او کے ۔۔۔ اگر آپ کہتی ہیں تو بدل لیتی ہوں۔"

"ہلکا سا میک اپ بھی کر لینا۔"

"کیوں خالہ جانی!"

"کوئی مہمان بن بلایا نہ ہو تو اس کا استقبال باقاعدہ تیار ہو کر کرنا چاہیے۔ اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔"

"مگر خالہ جانی! آپ کو پتا ہے کہ مجھے میک اپ کرنا اچھا نہیں لگتا ۔۔۔ آپ کہتی ہیں تو کپڑے تبدیل کیے لیتی ہوں۔"

یادگار کو لباس تبدیل کرنے اور میک اپ کرنے کی ترغیب دینا تو دراصل ایک جواز' ایک بہانہ تھا خود میرے رافع کے استقبال کو تیار ہونے کا!

ادھر یادگار تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے میں گئی' اُدھر میں کچن بتولن کے سپرد کر کے اپنے کمرے کی طرف لپکی۔

رافع کے آنے میں اب کچھ زیادہ وقت نہ تھا۔

O☆O

رافع کیا آیا' میرے گھر کے در و بام مسکرا اٹھے۔

میرا جی چاہ رہا تھا' بات بات پر ہنسوں' اونچے اونچے قہقہے لگاؤں مگر یادگار کی موجودگی اور اس کی نگاہیں مجھے محتاط رہنے اور فقط مسکرانے پر اکتفا کرنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

یادگار کی رافع سے اگرچہ پہلی ملاقات تھی مگر وہ اس سے اس قدر بے تکلفی اور اپنائیت سے باتیں کر رہی تھی جیسے مدتوں سے اسے جانتی ہو۔

رافع کی موجودگی مجھے ناقابلِ بیان مسرت بخش رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ غیر نہیں اپنا ہو۔ جیسے وہ میرے خاندان کا فرد ہو۔ اہم ترین فرد! جو میری زندگی کا محور ہو! جس کے گرد میری زندگی رقصاں ہو!

کھانے سے قبل ایک ایک گلاس تازہ جوس پینے کے دوران رافع' یادگار اور میں اکٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

موسم سے ملکی اور غیر ملکی سیاست تک ہم نے ہر موضوع کو تختۂ سخن بنایا اور ہر موضوع پر رافع کی گفتگو میں انگلستان کا ذکر نکل آتا۔

انگلستان کا موسم' وہاں کے لوگ' تمدن' سیاست' تخت و تاج' شاہی خاندان اور اس کی روایات۔ ملکہ' محل' انڈر گراؤنڈ ریلویز' سی سائیڈز۔ وہاں کے اسپتال' ڈاکٹرز اور نرسیں اور ان اسپتالوں میں علاج معالجے کے بہانے پاکستان کی نوکر شاہی کی عیاشیاں!

یادگار انتہائی دلچسپی اور محویت سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

میں کھانا لگوانے کے لیے اٹھی تب بھی وہ اسی دلچسپی اور محویت سے رافع سے گفتگو میں مصروف رہی۔

مجھے ان دونوں کو پہلی ہی ملاقات میں اس قدر بے تکلفی اور اپنائیت سے باتیں کرتے دیکھ کر انتہائی مسرت ہو رہی تھی۔ یادگار بہت کم لوگوں سے اتنی جلدی بے تکلف ہوتی تھی اور جو لوگ اسے بقول اس کے' پہلی ملاقات میں اچھے نہیں لگتے تھے' کبھی اچھے نہیں لگ پاتے تھے۔ ہمارے اپنے خاندان میں ایسے کئی لوگ تھے جن سے وہ رشتے داری کے باوجود قطعاً اجنبیت اختیار کیے رہی تھی اور جب کبھی کسی شادی غمی کے موقع پر ملنا ہوتا' ان لوگوں سے شاذ ہی بات کرتی۔ میں یا مجھلی آپا اسے اس کے اس رویّے پر ٹوکتیں تو وہ دو ٹوک لہجے میں کہتی "مجھے جو اچھا نہیں لگتا' نہیں لگتا۔"

رافع کے آنے سے پہلے مجھے یہی فکر تھی کہ اگر وہ یادگار کو اچھا نہ لگا تو کیا ہوگا؟ صد شکر کہ ایسا نہ ہوا تھا۔

کھانے کی میز پر کئی قسم کی ڈشیں دیکھ کر رافع نے مجھ سے کہا۔ "بے ایمانی کردی نا آپ نے!"

"کیا ہوا؟" میں نے تجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔

"آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ کھانے پر کوئی تکلف نہیں ہوگا' جو گھر میں ہوگا وہی کھائیں گے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی' یادگار نے کہا "ہم روزانہ ایسا ہی کھانا کھاتے ہیں۔" پھر مجھ سے اپنی بات کی تائید چاہی "کیوں خالہ جانی ہے نا؟"

میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"دیکھیے۔" وہ ہم دونوں کو تنبیہی نظروں سے باری باری دیکھتے ہوئے بولا "میں روزانہ کھانا کھانے کے لیے آنے لگوں گا۔"

"بسرو چشم!" میں نے بے ساختہ کہا۔

"پلیز! مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔" یادگار نے کہا۔

"بسم اللہ کیجیے ڈاکٹر صاحب۔" رافع مسکرا کر بولا۔

"پہلے مریض۔" یادگار نے شوخی سے کہا۔

"او کے۔" رافع نے اپنی پلیٹ سنبھال لی۔

میں اس کے روبرو بیٹھی تھی۔ کھانا شروع ہو چکا تھا اور باتیں بھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا' رافع' یادگار اور میں ساری زندگی اسی طرح ہنستے بولتے گزار دیں۔

کھانے کے بعد قہوہ پیا گیا۔

گیارہ سوا گیارہ بجے کے لگ بھگ جب وہ رخصت ہونے لگا تو اس نے مجھ سے کہا "تھینک یو ویری مچ۔"

"فار واٹ؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

"پلاٹ والے قصے سے جتنی ذہنی کوفت ہوئی تھی' آپ کے ہاں آکر وہ بھول گیا ہوں۔"

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب!" اس نے روئے سخن یادگار کی طرف کرتے ہوئے کہا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

"دوبارہ ضرور آئیے گا۔" یادگار نے اس سے کہا مگر یادگار کی پُرمعنی نگاہیں مجھ پر تھیں۔

"ضرور آؤں گا۔" رافع نے جواباً کہا۔

"پرومس؟"

"پرومس۔"

میں بہت خوش تھی۔ کیسا یادگار دن تھا!

اس کے جانے کے بعد یادگار مجھ سے بولی "خالہ جانی زبردست!"

"کیا؟ کیا زبردست؟"

"آپ کے یہ کلاس میٹ۔"

"اچھا!"

"ہوں۔۔۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ کوئی بڑے میاں سے ہوں گے مگر یہ تو بہت شان دار نکلے۔"

"تمہاری تو دوستی ہو گئی نا؟"

"جی جناب۔"

اس رات میں نے وہ خواب دیکھے جو مجھے اپنی نوجوانی میں دیکھنے چاہئے تھے مگر نوجوانی میں مجھے فرصت کہاں تھی خواب دیکھنے کی!

○☆○

اگلے دن ہفتہ واری تعطیل تھی۔ میں دن چڑھے تک سوتی رہی۔ جاگی تو یادگار اسپتال جا چکی تھی۔

دن مجھے بہت نکھرا نکھرا لگا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

ناشتا کرنے کے لیے بیٹھی تو ڈائننگ لاؤنج کی کھلی کھڑکی سے در آنے والی سورج کی کرنوں کو اپنی آغوش میں مچلتے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے ادا کا یہ شعر یاد آگیا۔

یہ میری گود میں مچلی ہوئی ننھی سی کرن
اک نئی صبح کا آغاز حسیں ہے کہ نہیں!

گزری رات کا خمار ہنوز میرے قلب و روح کو مدہوش کیے ہوئے تھا۔ رافع کس قدر ہینڈسم لگ رہا تھا! اس کے خاکستری بالوں نے اس کی شخصیت کو انتہائی پُروقار بنا رکھا تھا اور اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی وہ دلنواز مہک!

میں نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اس مہک کو یاد کرنے کی کوشش کی۔

اوہ! حیرت انگیز! ناقابلِ یقین! میں نے اپنے مشامِ جاں کو بعینہٖ اسی خوش بو سے مہکتے پایا! مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے آس پاس ہی کہیں موجود تھا!

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ڈائننگ لاؤنج میں بس میں تھی اور کوئی نہیں۔ جس کی موجودگی کے احساس نے مجھے چونکا دیا تھا اس کا تو دور دور تک کہیں پتا نہ تھا۔

خدایا! کیا محض تصور کے سہارے کسی کی قربت کا اتنا گہرا احساس کیا جا سکتا ہے۔

میری چشمِ تصور میں گزری رات کے مناظر پھر ڈولنے لگے۔ اس کا بولنا' اس کی مسکراہٹ' اس کا سگریٹ کے کش کھینچنا اور ننھے ننھے مرغولوں کا اخراج۔

"خدا جانے اس وقت وہ کیا کر رہا ہوگا!" میں نے سوچا "کیا وہ بھی میری نشست و برخاست' میری حرکات و سکنات کو اسی طور یاد کر رہا ہوگا۔"

میرا دل چاہا' اسے فون کروں۔ پوچھوں کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اندازہ کروں کہ کیا وہ بھی میری طرح بے قرار تھا!

میں اسے فون کرنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میرا دل بے اختیار دھڑکا۔

"ہیلو!" میں نے کال ریسیو کی۔

"گڈ مارننگ میڈم!"

اوہ! وہی تھا۔
"گڈ مارننگ!"
"ہاؤ آر یو؟"
"فائن..... تھینک یو..... آپ سنائیے۔"
"کیا سناؤں جناب..... آپ کے کھانوں کا نشہ اب جا کے ٹوٹا ہے..... ابھی ابھی جاگا ہوں اور جاگتے ہی آپ کا خیال آیا۔"
میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔
"ہیلو!" اس کے لہجے میں بے قراری تھی۔
"ہیلو!"
"تھینکس گاڈ! میں سمجھا لائن کٹ گئی۔"
"نہیں..... میں سن رہی ہوں۔"
"بائی دی وے، آج شام آپ کیا کر رہی ہیں؟"
"کچھ نہیں..... آج تو چھٹی کا دن ہے، فارغ ہوں۔"
"آج شام باہر کیوں نہ گزاریں۔"
"کہاں؟"
"کہیں بھی..... کسی اچھی سی جگہ..... جہاں کھانا بھی مل سکے۔"
"اگر یہ بات ہے تو آپ یہاں آجائیے..... ہمارے ہاں دونوں وقت کھانا ملتا ہے۔"
"سوچ لیں..... تنگ آجائیں گی۔"
"بری بات..... بغیر ثبوت کے کسی پر الزام تراشی نہیں کرتے۔"
وہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ میں مسکرا دی۔
"خیر آج تو آپ شرفِ میزبانی ہمیں بخشیے۔" وہ بولا۔
"کیا ضروری ہے؟"
"مجھے خوشی ہوگی۔" وہ ملتجی لہجے میں بولا۔
"اوکے..... جیسے آپ کی مرضی۔"
"گڈ! تو شام سات بجے میں آپ کو لینے آرہا ہوں۔"
"کہاں؟..... میں خود پہنچ جاؤں گی۔"
سفرِ زندگی میں اب تک تنہا اور خود مختار رہنے کے بعد کم از کم اتنا تو استحقاق ہونا چاہیے تھا مجھے۔
"نہیں..... نہیں، میں پک کرلوں گا۔"
خوشنود بابا اور بتولن کیا سوچیں گے..... اور پھر اس وقت تو یادگار بھی گھر پر ہوگی..... اور..... جس وقت وہ مجھے پک کرنے آیا اسی وقت کوئی اور مثلاً بڑی آپا یا مجھلی آپا ہی آگئیں تو! میں الجھن میں پڑ گئی۔
مجھے سخت کوفت ہونے لگی۔ توبہ! اڑتالیس برس کی ہو کر میں یوں گھبرا رہی تھی جیسے سولہ سال کی لڑکی!
ساری زندگی مردانہ وار زندگی کا سامنا کرنے کے باوجود میں ایک ایسے شخص کے ساتھ شام گھر سے باہر گزارنے کے خیال سے کانپ رہی تھی جو شاید میری پہلی اور آخری محبت تھا!

"ہیلو!"
"جی!"
"ٹھیک ہے تو پھر باقی ملاقات پر۔"
میرے جی میں آیا کوئی بہانہ کردوں مگر نہیں..... وہ برا مان گیا تو! کتنے پیار سے دعوت دے رہا تھا! میں نے اپنی بزدلی پر لعنت بھیجی۔
"اوکے!" میں نے دھیرے سے کہا۔
"اور ہاں..... یادگار کو بھی ساتھ لے لیجئے گا۔"
اوہ! کتنا خیال تھا اسے میرا! اس نے کل اندازہ کرلیا ہوگا نا کہ میں یادگار کو کتنا پیار کرتی ہوں۔ تبھی..... تبھی تو وہ یادگار کو بھی ساتھ لینے کو کہہ رہا تھا۔
SO NICE OF HIM- کس زبان سے میں اس کا شکریہ ادا کرتی۔ چلو اس بہانے میری مشکل بھی آسان ہوگئی تھی۔ اکیلے جانے کا مسئلہ نہ رہا تھا!

O☆O

یادگار تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہا کرتی تھی۔ آؤٹنگ، ہوٹلنگ اور شاپنگ تو اس کے محبوب ترین مشاغل تھے۔
"میرا بس چلے تو ساری زندگی آؤٹنگ، ہوٹلنگ اور شاپنگ ہی کرتی رہوں۔" وہ ہنس کر کہا کرتی تھی۔
ہاسپٹل سے اس کی واپسی پر میں نے اسے بتایا کہ رافع نے ہمیں شام کو مدعو کر رکھا تھا تو وہ اچھل پڑی "رئیلی!"
"ہوں۔"
"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی..... فٹافٹ تیار ہو جاؤ..... پونے چھ بج رہے ہیں، سات بجے وہ ہمیں پک کرنے آجائیں گے۔"
"بائی دی وے، لے جائیں گے کہاں؟"
"وہ جانیں یا خدا جانے۔"
"نہیں..... کچھ کچھ تو میں بھی جانتی ہوں۔"
"کیا!" میرا دل دھڑکا اور میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"کہ اس شہر میں کون کون سی جگہیں ہیں جہاں عمدہ کھانا ملتا ہے۔"
میں مسکرا دی "ندیدی لڑکی، جلدی سے تیار ہو جاؤ..... مجھے بھی تیار ہونا ہے۔"
"ہائیں! آپ اب تک تیار کیوں نہیں ہوئیں!" اس نے سرتاپا مجھے دیکھا۔
"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی..... اگر تم نہ جاتیں تو میں معذرت کرلیتی۔"
"اوہ خالہ جانی! میں ایسے نیکی کے کاموں سے انکار کرسکتی ہوں بھلا۔"
"آدھے گھنٹے میں، میں تمہیں تیار دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی آئی۔" اس نے چٹکی بجائی اور اپنے کمرے کی طرف لپک گئی۔

یادگار تو شاید آدھے گھنٹے میں تیار ہو بھی گئی' میں اس وقت چونکی جب ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے میں نے کال بیل کی آواز سنی۔

میں نے سلک کی گلابی ساڑی پہن رکھی تھی۔

آرائش حسن کی وہ تمام مصنوعات استعمال کی تھیں جو میرے چہرے' گردن' ہاتھوں اور پیروں کو نکھار بخش سکتی تھیں۔

ہیئر ڈائی اور شیمپو کنڈیشنر نے میرے تراشیدہ بالوں کو چمک دار سیاہ بنا رکھا تھا۔

میرے کانوں میں جڑاؤ ٹاپس تھے' گلے میں دہری زنجیر والا لاکٹ اور ہاتھوں کی انگلیوں میں جڑاؤ انگوٹھیاں۔ میرے بائیں ہاتھ کی کلائی پر بیش قیمت گھڑی تھی اور دائیں کلائی میں دو کنگن۔

کال بیل سن کر میرا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ میں نے آئینے سے آشیرباد چاہی۔

میرے کمرے کے بند دروازے پر دستک اور یادگار کی آواز ایک ساتھ سنائی دیں "خالہ جانی! شاید وہ آگئے ہیں۔"

"بس آگئی بچے۔" میں نے کہا۔

میں نے آخری بار سراپا خود کو آئینے میں دیکھنے کے بعد دروازے کا رخ کیا لیکن اگلے ہی لمحے میں پھر ڈریسنگ ٹیبل کے رخ پلٹ گئی۔ اوہ! پرفیوم تو یاد ہی نہیں رہی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی خوشبویات میں سے میں نے اپنی محبوب ترین خوشبو اٹھائی اور اپنے اوپر چھڑکی۔

"خالہ جانی!" باہر سے یادگار کی آواز آئی۔

"آرہی ہوں۔" خوشبو کی شیشی رکھ کر میں نے اپنا پرس اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

یادگار باہر کھڑی تھی۔ اس نے سادہ سا سوتی جوڑا پہن رکھا تھا' بال معمول کے اسٹائل میں آراستہ کیے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی لپ اسٹک تھی اور پیروں میں کورٹ شوز۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکلی تو اس نے مجھے مسرت آمیز استعجاب کے ساتھ دیکھا اور بولی "زبردست خالہ جانی زبردست!"

میں نے جھینپ کر اس سے نظریں چرالیں۔

"آج تو شہر پتھر کا بن جائے گا خالہ جانی!" اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا زیادہ باتیں مت بناؤ..... کیا رافع صاحب آگئے؟"

"گھنٹی بجی تو تھی۔"

تبھی بتولن نے آکر ہمیں بتایا کہ وہ آچکا تھا۔ مجھے دیکھ کر بتولن کی آنکھوں میں بھی معنی خیز چمک لہرانے لگی تھی!

وہ باہر گاڑی ہی میں ہمارا منتظر تھا۔ میں نے اسے اندر آنے اور ایک کپ چائے پینے کی دعوت دی تو وہ بولا "پھر کبھی سہی اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

ہم دونوں عقبی نشست پر بیٹھ گئے اور اس کے گاڑی اسٹارٹ کرنے کا انتظار کرنے لگے مگر وہ اپنے سامنے آویزاں آئینے میں جھانکتے ہوئے بولا "کیوں صاحب! اگلی سیٹ منحوس ہے؟"

آئینے میں میری نظریں اس سے ملیں اور میں نے نظریں چرالیں "جاؤ یادگار! تم آگے بیٹھ جاؤ۔" میں نے یادگار سے کہا۔

یادگار نے میری طرف دیکھا "جاؤ بیٹا!" میں نے پیار سے کہا۔

وہ گاڑی سے اتری پھر آگے بیٹھ گئی "تھینک یو۔" رافع نے کہا اور اگنیشن میں لگی چابی گھمائی۔

مین روڈ کا رخ کرتے ہوئے اس نے کہا "اب آپ ہی بتائیں گی مجھے کہ کہاں جانا ہے کیوں کہ میں اس شہر سے دوبارہ آہستہ آہستہ مانوس ہو رہا ہوں۔"

"آپ فکر نہ کیجئے' میں بتاؤں گی۔" یادگار چہک کر بولی۔

"گڈ!" اس نے کہا۔

"یادگار کو آؤٹنگ' ہوٹلنگ اور شاپنگ کا بہت شوق ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا کیا آپ نے بتا دیا۔" وہ سامنے مرر میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"خالہ جانی! شوق تو مجھے اور بھی بہت سی چیزوں کا ہے۔" یادگار چہکی۔

"مثلاً؟" رافع نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"فی الحال آپ اپنی توجہ ڈرائیونگ پر رکھیے کیوں کہ مجھے مرنے کا شوق بہرحال نہیں ہے۔" وہ ہنس دیا۔

وہ ایک یادگار شام تھی۔ ہم نے ریوالونگ ریستوران سے شہر کا نظارہ کرتے ہوئے کافی پی۔ لمبی ڈرائیو پر رہے۔ ڈھیروں باتیں کیں۔ ہنستے ہنساتے رہے پھر رات کو ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھایا۔

میں بہت خوش تھی..... اور مجھ سے زیادہ یادگار!

O☆O

پھر ہم نے بہت سی شامیں اکٹھے گزاریں' میرا مطلب ہے میں نے' رافع اور یادگار نے!

جب تک یادگار کی ڈے ڈیوٹی رہی' کبھی وہ ہمارے ہاں آتا اور کبھی ہمیں گھر سے باہر مدعو کرتا رہا۔ شروع شروع وہ آنے سے قبل پیشگی اطلاع دے دیا کرتا تھا۔

"ہاں جی آج کیا پروگرام ہے؟" وہ پوچھتا۔

"کچھ نہیں۔" میرا جواب عموماً یہی ہوتا۔

"اوکے..... تو پھر میں آرہا ہوں آج آپ کی طرف۔"

"رائٹ!"

وہ آتا تو ہمیں اپنا منتظر پاتا۔ ہم ہنستے بولتے' کھاتے پیتے اور اکثر باہر گھومنے پھرنے نکل جاتے۔

"میں..... میں' آپ لوگوں کو ڈسٹرب تو نہیں کرتا؟" کبھی کبھی

وہ تکلفاً پوچھتا۔

"تھاٹ ایٹ آل!" مجھ سے پہلے ہی یادگار کہتی۔

پہلے وہ اطلاع دے کر آیا کرتا تھا پھر بغیر اطلاع کیے آنے لگا۔

"یہاں سے گزر رہا تھا' میں نے سوچا آپ لوگوں سے ہیلو ہائے کرتا چلوں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی معذرت خواہی ہوتی۔

"بہت اچھا کیا۔" میرا اور یادگار کا ایک ہی جواب ہوتا۔

گھر آئے کسی مہمان سے کون یہ کہتا ہے کہ اس نے آکر برا کیا۔ اس کا تو انتظار رہنے لگا تھا مجھے اور شاید یادگار کو بھی!

"ذرا گھومنے پھرنے کے لیے نکلا تھا۔ میں نے سوچا آپ لوگوں کو بھی لے لوں۔" کبھی وہ اپنی بنا اطلاع آمد کا جواز کچھ اس طرح پیش کرتا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" یادگار چہکتی۔

ایک روز وہ ہوٹل میں ہونے والی ایک محفلِ موسیقی کے ٹکٹ لے آیا۔

اس کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے چلے جانا یا کہیں بیٹھ کر کھانا لینا دوسری بات تھی مگر رات گئے تک جاری رہنے والی محفلِ موسیقی میں اس کے ساتھ جانا اور بات۔ کوئی جاننے والا مل جاتا تو!

مگر یادگار میری جان کو آگئی "خالہ جانی! پلیز چلیں نا.... تھوڑی دیر بیٹھیں گے پھر چلے آئیں گے۔"

میں نے بہت ٹالا مگر وہ نہ مانی۔ مجبوراً جانا پڑا۔

فرشی نشست تھی۔ ہم اس طرح بیٹھے کہ یادگار میرے اور اس کے درمیان تھی۔ میں بار بار چپکے چپکے اِدھر اُدھر ہی دیکھتی رہی کہ کوئی شناسا تو اس محفل میں موجود نہ تھا۔

اس کی بنا اطلاع آمدورفت کے باعث میں گھر میں بھی ہمہ وقت نوک پلک سنوارے رہنے لگی۔

پھر ایک روز اس نے ہمیں اپنے گھر مدعو کیا۔ اس کا گھر اور اس گھر کی ایک ایک چیز مجھے بہت اپنی اپنی سی لگی۔

"اتنے بڑے گھر میں آپ اکیلے رہتے ہیں؟" یادگار نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"اکیلے پن سے آپ کا دل نہیں گھبراتا؟"

"بہت زیادہ۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر نظریں چرالیں۔

"یہ گھر آپ نے کب خریدا؟" یادگار نے پوچھا۔

"خریدا نہیں.... مجھے ورثے میں ملا تھا اپنے والدین کی طرف سے.... میں انگلینڈ چلا گیا تو میرا ایک ملازم اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں رہتا بھی رہا اور اس گھر کی دیکھ بھال بھی کرتا رہا۔"

"مگر یہاں تو ساری چیزیں نئی نئی سی لگ رہی ہیں۔"

"میں نے واپس آنے کے بعد RENOVATE کرایا ہے۔"

"تبھی۔"

مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ رافع کے سامنے یادگار میرے مقابلے میں زیادہ بولتی چالتی تھی۔

"رافع! آپ کی ایک بہن بھی تو تھیں۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں.... ناروے میں۔"

"آپ کہاں ہیں؟" یادگار نے پوچھا۔

"اب بھی وہیں رہتی ہیں۔"

"آپ سے ملنے نہیں آتیں؟"

"جب میں انگلینڈ میں تھا تو ہالیڈیز میں کبھی وہ آجاتی تھیں اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ' کبھی ہم چلے جاتے تھے۔"

"بہت مزہ آتا ہوگا!" یادگار بولی۔

"بہت۔"

"آپ سے انگلینڈ کا اتنا زیادہ ذکر سن کر میرا بھی جی چاہنے لگا ہے وہاں جانے کو۔"

"ارے! یہ کون سی بڑی بات ہے.... لے چلیں گے ہم آپ کو وہاں۔"

اف! یادگار کتنا بولتی تھی۔ اسے بولنے کو موضوعات اور جملے بھی تو نہ جانے کہاں سے ہاتھ لگ جاتے تھے۔ مجھے تو بولنے سے پہلے بہت دیر سوچنا پڑتا۔

"ارے ہاں وہ.... وہ فیکٹری کا کیا بنا؟"

"کیا بننا تھا.... ڈراپ کردیا۔"

"کیوں؟" میں چونکی۔

"ابتدا ہی غلط ہوگئی۔"

میں سمجھ گئی وہ پلاٹ والے قضیے کی بات کر رہا تھا۔

"بہت بددل ہوا میں۔"

واقعی ہوا ہوگا۔ ایسے قضیوں سے تو یہاں رہنے والے گھبرا جاتے ہیں۔ وہ تو عرصۂ دراز وہاں گزار کر آیا تھا جہاں ہر کام قاعدے' قرینے اور دیانت داری سے ہوتا تھا۔

○☆○

اس روز یادگار کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ رافع آیا تو وہ جاچکی تھی۔ وہ حسبِ معمول بہت بے تکلفی سے لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ میں نے بتولن سے چائے بنانے کو کہا اور اس کے ساتھ جا بیٹھی۔ چائے آنے تک ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ یادگار کی عدم موجودگی میں' میں اس کے سامنے کچھ نروس ہورہی تھی اور اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے انجانی سی بے آرامی محسوس کررہی تھی۔

میں سوچ رہی تھی' مجھے اس کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر گھر کے ملازمین خدا جانے کیا خیال کررہے ہوں گے۔

مجھے کسی کے آجانے کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا۔ اگرچہ بڑی آپا' منجھلی آپا اور سعدیہ کے لیے وہ اجنبی نہ رہا تھا۔ اس سے نہ صرف ان کی بلکہ ان کے شوہروں اور بچوں کی ملاقات بھی ہوچکی تھی مگر یادگار کی موجودگی میں!

اس کی خاطر تواضع کرتے ہوئے میرے ہاتھ پاؤں پھولتے رہے۔

"آج بہت سناٹا ہے۔" وہ بولا۔

"جی ہاں۔۔۔ یادگار گھر میں نہ ہو تو ایسے ہی سناٹا چھا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"نائٹ ڈیوٹی کتنے دن چلے گی؟"

"ایک ماہ!"

"گویا! اس کا مطلب ہے ایک مہینے تک یہی سناٹا رہے گا۔"

"جی!"

"نہیں صاحب نہیں۔۔۔ ایسے مزہ نہیں آتا۔۔۔ زندگی میں جب تک شور شرابا اور ہلا گلا نہ ہو' زندگی زندگی ہی نہیں لگتی۔"

"مجبوری ہے ورنہ۔۔۔ یادگار کے بغیر تو خود میرا بھی دل نہیں لگتا گھر میں۔"

"آپ کو عادی کرنا چاہیے اپنے دل کو ورنہ مشکل ہو جائے گی۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"جی!" میں نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرا دیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کیسی معنی خیز بات کہہ گیا تھا وہ!

میرے جی میں آیا کہوں "جب تک یادگار اپنے گھر کی نہیں ہو جاتی' جہاں میں رہوں گی وہیں وہ رہے گی۔" لیکن حجاب آڑے آگیا۔ دل کی بات میں زبان پر نہ لا سکی۔

اس روز وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ میں سمجھ گئی کہ اس نے میری کیفیت تاڑلی ہو گی۔

اس کے جاتے ہی میں نے یادگار کو فون کیا اور بتایا "رافع صاحب آئے تھے اور تمہارے بغیر اداس ہو رہے تھے۔"

"رئیلی!"

"ہاں!"

"سچ خالہ جانی! آج مجھے بھی نائٹ ڈیوٹی بہت بری لگ رہی ہے۔۔۔ کتنے مزے کیے ہم نے اتنے دن تک۔"

"اگر کسی بہانے سے ڈیوٹی چینج کرا سکتی ہو تو کرا لو۔"

"بہت مشکل ہے خالہ جانی!"

O☆O

اگلی صبح میں آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ اس کا فون آگیا۔

"گڈ مارننگ!" اس کی آواز سے عیاں تھا کہ وہ ابھی ابھی جاگا تھا۔

"صبح بخیر!" میں بشاشت سے بولی۔

"رات کیسی گزری؟" اس نے پوچھا۔

میرا دل بے مہار ہو گیا "جیسی ہر رات گزرتی ہے۔" میں نے اپنے دل کی کیفیت لہجے سے نہ عیاں ہونے دی۔

"صاحب! میں بہت ڈسٹرب رہا۔"

"خیریت!" میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لینے کی کوشش کی۔

"دس بارہ دن اتنی اچھل رہی زندگی میں کہ میں تو انہی کو "حاصلِ زندگی" سمجھنے لگا ہوں۔"

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ بے چارہ! لُوٹا ہوا مرد! مجھے اپنا پر غصہ آنے لگا۔ غاصب اور خائن کہیں کی! پہلے میرے حق پر اتنے چپکے سے ڈاکا ڈالا کہ مجھے کانوں کان خبر نہ ہونے دی پھر رافع کی امانت میں خیانت کی مرتکب ہوئی۔

اس کے ہرجائی پن نے بے چارے رافع کو اتنا دل شکستہ کر دیا تھا کہ وہ میرے ساتھ گزارے ہوئے چند دنوں کو حاصلِ زندگی قرار دے رہا تھا۔ اپنا نے اسے کوئی سکھ دیا ہوتا تو وہ ایسا کیوں کہتا۔

"میں تمہارے سارے دکھ اپنی پلکوں سے چن لوں گی رافع۔" میں نے دل ہی دل میں عہد کیا۔

"آج کیا پروگرام ہے؟" اس نے اسی خواب آگیں لہجے میں پوچھا۔

"آفس جانے کو تیار ہو رہی ہوں۔۔۔ حسبِ معمول شام کو واپسی ہو گی۔" میں نے بتایا۔

"یادگار آگئیں؟"

"جی ہاں۔"

"ذرا بلائیں تو پوچھوں کہ کل شام ہم دونوں ہی نے مس کیا ڈاکٹر صاحب کو یا انہوں نے بھی کیا ہمیں۔"

"آئی ایم سوری' وہ تو سو گئی ہے۔۔۔ نائٹ ڈیوٹی کر کے آئے تو وہ گھر آتے ہی سو جایا کرتی ہے۔۔۔ آپ کہیں تو جگا دوں۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں رہنے دیں۔۔۔ میں بعد میں فون کر لوں گا۔"

"بارہ ایک بجے تک جاگ جائے گی وہ۔"

"رائٹ۔۔۔ رائٹ۔" وہ بولا "اچھا۔۔۔ آپ کو دیر ہو رہی ہو گی۔ آپ جانے کی تیاری کریں۔"

کتنا خیال تھا اسے میرا! میں نے دفتر جانے کے لیے ادھوری تیاری پوری کی اور دفتر روانہ ہو گئی۔ راستے بھر اس کا خیال میرے دل کے ساتھ رہا۔

بارہ بجے کے لگ بھگ میں نے گھر فون کیا تو بتولن نے بتایا کہ یادگار سو رہی تھی اور رافع اس سے بات کرنے کے لیے دو مرتبہ فون کر چکا تھا۔

لنچ بریک کے بعد یادگار نے مجھے فون کیا اور بتایا "خالہ جانی! رافع صاحب کا فون آیا تھا۔"

"ہاں۔ صبح تمہارے سونے کے بعد بھی آیا تھا مگر میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بتولن بتا رہی تھی بعد میں بھی فون کیا تھا انہوں نے مگر تم اس وقت تک جاگی نہیں تھیں۔" میں نے کہا۔

"آپ کو تو پتا ہے نا خالہ جانی! مجھے نائٹ ڈیوٹی کے بعد کس قدر ٹوٹ کر نیند آتی ہے۔ پتا نہیں اور لوگ کیسے آرام سے سو لیتے ہیں نائٹ ڈیوٹی کے دوران ہاسپٹل میں۔ قسم سے میری تو پلک نہیں

جھجکتی۔"
"میں نے بتا دیا تھا انہیں کہ تم نائٹ ڈیوٹی کے بعد گھر آتے ہی سو جاتی ہو۔۔۔ اصل میں کل شام انہوں نے تمہیں بہت مس کیا۔"
"ہاں۔ مجھ سے بھی کہہ رہے تھے وہ۔"
"اور؟ اور کیا کہہ رہے تھے؟"
"کوئی خاص بات نہیں۔۔۔ ہاں کہہ رہے تھے ڈیوٹی چینج کرالو۔"
"پھر تم نے کیا کہا؟"
"وہی جو میں نے آپ سے کہا تھا۔۔۔ بہت مشکل ہے۔"
"پھر؟ پھر کیا بولے؟"
"کہنے لگے کچھ نہ کچھ حل نکالیں گے اس مشکل کا۔"
میں دھیرے سے مسکرا دی۔
میری وجہ سے یادگار کا بھی کتنا خیال رہنے لگا تھا رافع کو!

○☆○

یادگار سے بات ہونے کے بعد میں نے رافع کو فون کیا تو اس کے ملازم سے معلوم ہوا کہ وہ ذرا دیر پہلے ہی گھر سے نکل گیا۔
"شاید میری طرف ہی آرہا ہو۔" میں نے سوچا اور اپنی نوک پلک سنوارنے کو باتھ روم میں جا گھسی۔
اس کا انتظار کرتے کرتے سہ پہر ہو گئی۔
میں نے دوبارہ اس کے گھر فون کیا۔ پتا چلا وہ ہنوز واپس نہ لوٹا تھا۔
شام کو میں گھر پہنچی تو یادگار ٹی وی کے سامنے بیٹھی بڑے انہماک سے کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو کرل کر رکھا تھا اور اس کا چہرہ میک اپ سے عاری ہونے کے باوجود نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔
اس کے نو دمیدہ چہرے کو ندیدی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میں گھٹی گھٹی ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ کبھی میرا چہرہ بھی اسی طرح قدرتی شادابی کا مظہر ہوا کرتا تھا مگر اب۔۔۔!
رافع سے ملنے کے بعد سے تو میں مسلسل بر سرِ پیکار تھی! آہ! کتنی تگ و دو کرنا پڑ رہی تھی مجھے۔ اپنی عمر چھپانے کے لیے کیا کچھ کرتی پھر بھی۔۔۔ پھر بھی پہلے کی سی بات نہ آئی تھی۔
"میں بھی اپنے بالوں کو کرل کروں گی۔" میں نے یادگار کے گھنگھریالے بالوں کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا لیکن اس طرف دھیان نہ گیا کہ میری عمر اب بالوں میں کرلز لگانے کی نہیں رہی تھی۔
شام کا وقت تھا اور مجھے رافع کے آنے کا یقین تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر از سرِ نو تیار ہونے کے بعد میں لاؤنج میں پہنچی تو رافع آیا بیٹھا تھا اور یادگار صوفے پر آلتی پالتی مارے اس سے باتیں کر رہی تھی۔
"ہیلو!" اس نے کہا۔
"ہیلو!" میں مسکرائی۔
"دیکھیے آج میں وقت سے پہلے ہی آگیا۔" رافع نے کہا۔
"اوہ!" یادگار نے اپنی نازک کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولی "میں لیٹ ہو رہی ہوں۔"
اس نے زقند لگائی اور تیار ہونے کو لپکی۔
رافع نے اسے جاتے دیکھا پھر مجھے دیکھا اور مسکرا دیا۔
"چائے پئیں گے یا کافی؟"
"جو جی چاہے پلوا دیں۔" وہ سپردگی کے انداز میں بولا۔
مجھے اس کی یہ سپردگی اچھی لگی۔ میں بتولن کو پکارنا چاہتی تھی کہ وہ ٹرالی دھکیلتی لاؤنج میں داخل ہوئی۔
ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ یادگار تیار ہو کر آ پہنچی۔ لینن کا کالا جوڑا اس پر غضب کی پھبن دے رہا تھا۔ اس کا دلکش دمکتا چہرہ اور سیاہ زلفیں بدلیوں کی اوٹ میں چاند کی تفسیر بنے ہوئے تھے۔
اس نے اپنے ہونٹوں پر خلافِ طبع نہ جانے کیوں گہری لپ اسٹک لگا رکھی تھی!
"اچھا جی میں تو چلتی ہوں۔" یادگار نے کہا۔
"کیسے جاتی ہیں؟" رافع نے پوچھا۔
"کبھی خالہ جانی لفٹ دے دیتی ہیں۔" یادگار نے شوخی سے کہا "کبھی پبلک ٹرانسپورٹ لینی پڑتی ہے۔۔۔ آج تو پبلک ٹرانسپورٹ ہی لوں گی۔"
"میں ڈراپ کردوں؟" رافع نے اجازت طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔
اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، یادگار بولی "نیکی پوچھ کر نہیں کی جاتی۔"
وہ ہنس دیا اور ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس کا اچانک اٹھ جانا اچھا نہیں لگا۔ اگر اسے یوں اچانک ہی اٹھنا تھا تو اسے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھنے کی ضرورت کیا تھی!
"جاؤں خالہ جانی؟" یادگار نے پوچھا۔
"جاؤ۔" مجھے اپنی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔
"چلیں جناب!" یادگار نے اس سے کہا۔
"اوکے۔" رافع نے میری طرف دیکھا۔
پھر وہ دونوں چلے گئے اور میں گھر میں اکیلی رہ گئی!

○☆○

اگلی صبح دفتر کے لئے تیار ہوتے ہوئے نہ جانے کیوں میں اس کے فون کا انتظار کرتی رہی مگر میرا انتظار بار آور نہ ہوا۔
مایوسی کی اسی کیفیت میں، میں دفتر چلی گئی۔
دفتر پہنچنے کے بعد میں نے رافع کے گھر فون کیا تو پتا چلا وہ ایک مرتبہ جاگنے کے بعد دوبارہ سو گیا تھا۔
گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے پھر فون کیا تو پتا چلا کہ وہ باتھ روم میں تھا۔ میں نے اس کے ملازم سے کہا "نکلیں تو بتا دینا مس حبیبہ کا فون آیا تھا۔"

میں اس کی فون کال کا انتظار کرتی رہی مگر بے سود!

"ہو سکتا ہے ملازم نے اسے میری فون کال کے بارے میں بتایا ہی نہ ہو۔" میں نے سوچا۔

بارہ بجے کے قریب میں نے پھر اس کا نمبر ملایا تو ملازم نے بتایا وہ گھر سے باہر جا چکا تھا۔

"میرے فون کا بتایا تھا انہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی' بتا دیا تھا۔"

بتا دیا تھا! پھر کیوں نہیں کیا تھا اس نے مجھے فون!

"شاید ادھر ہی آ رہا ہو۔" میں نے خود کو تسلی دی۔

گھر فون کیا۔ صبح سے اب تک گھر پر یہ میری چوتھی فون کال تھی۔ یادگار باتھ روم میں تھی۔

لنچ بریک کے وقت میں لنچ کے لیے اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ قطعاً غیر متوقع طور پر رافع اور رافع کے ساتھ یادگار بھی آ پہنچی۔

یادگار کا فیکٹری آنا میرے لیے اچنبھے کی بات نہ تھی۔ وہ پہلے بھی آ چکی تھی مگر رافع کے ساتھ اس کا آنا میرے لیے قدرے حیران کن امر تھا۔

"تم!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"جناب! ہم آپ کو سرپرائز دینے آئے ہیں۔" یادگار مسکرا کر بولی۔

سرپرائز تو واقعی دے دیا تھا ان کی آمد نے مجھے! بس یہ جاننا باقی رہ گیا تھا کہ رافع گھر گیا تھا یادگار کو پک کرنے کے لیے یا......!

"اب آپ فٹافٹ اٹھ جائیں ہمارے ساتھ چلنے کے لیے۔" رافع نے کہا۔

"کہاں؟"

"لنچ کے لیے۔"

"لنچ کے لیے!"

"جناب!" رافع نے کہا۔

"میں تو مسٹر برگر جاؤں گی۔" یادگار بولی۔

"جہاں کہو گی' وہیں چلیں گے۔" رافع نے کچھ عجیب سی نظروں سے یادگار کو دیکھا۔

مجھے اس کی نگاہوں اور لہجے دونوں کی یادگار سے بے تکلفی اچھی نہ لگی!

سچ تو یہ تھا کہ مجھے یادگار کا اس کے ساتھ آنا ہی اچھا نہ لگا تھا۔

"اٹھئے نا خالہ جانی!" یادگار مجھ سے بڑے لاڈ اور اصرار سے بولی۔

"مجھے بہت کام ہے۔"

"چلیں چلیں.... کام کو گولی ماریں۔" رافع نے کہا۔

میں نے رافع کی طرف دیکھا۔

"پلیز!" اس کی نگاہوں اور لہجے دونوں میں لجاجت تھی۔ میں کشمکش میں پڑ گئی۔

"کم آن!" یہ کہتے ہوئے اس نے میری کلائی پکڑلی۔

میں سٹپٹا کر رہ گئی۔ سر سے پاؤں تک میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی مرد نے اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا۔

لحظہ بھر کو دم بخود رہ جانے کے بعد میں نے ایک سراسیمگی کی کیفیت میں اپنی کلائی کھینچ لی۔ وہ ہنس دیا۔

میری نگاہیں یادگار کی نظروں سے ملیں۔ وہ مجھی کو دیکھ رہی تھی مگر مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے تجاہلِ عارفانہ کا تاثر دینے کی کوشش کی۔ میں خفیف ہو گئی۔

"خالہ جانی! میرے پیٹ میں چوہوں کی دوڑ شروع ہو چکی ہے۔" یادگار ٹھنک کر بولی۔

"اٹھئے شاباش!" رافع نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے اٹھنا پڑا۔ یادگار نے مسٹر برگر جانے کی فرمائش کی تھی سو وہ ہمیں مسٹر برگر ہی لے گیا اور وہاں سے واپسی پر اس نے پہلے مجھے میرے آفس ڈراپ کیا پھر یادگار کو گھر پہنچانے چلا گیا۔

مجھے گھر سے فیکٹری یا فیکٹری سے گھر آتے جاتے زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹا لگتا تھا مگر میں نے یادگار کو گھر پہنچنے کے لیے دگنا وقت دیا!

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے گھر فون کیا تو معلوم ہوا یادگار گھر نہیں پہنچی تھی!

میں تشویش میں پڑ گئی یا شاید اندیشوں میں!

یادگار کو گھر پہنچنے میں پونے دو گھنٹے لگے اور اس دوران میں گھر پر چار پانچ مرتبہ فون کر چکی تھی۔ بتولن نے یادگار کو میری فون کالز کی بابت بتایا۔

"خیریت تو ہے خالہ جانی! بتولن بتا رہی تھی آپ نے کئی مرتبہ فون کیا۔" یادگار نے مجھے فون کیا تو کہا۔

"ہاں.... وہ.... میری سائیڈ بورڈ پر بجلی کا بل رکھا ہے ذرا بتانا تو اس کی ڈیو ڈیٹ کیا ہے۔" مجھے کوئی اور بہانہ ہی نہ سوجھا تھا۔

"ہولڈ کیجئے میں دیکھتی ہوں۔"

ذرا دیر بعد وہ دوبارہ لائن پر تھی۔ "چھبیس تاریخ ہے خالہ جانی!"

"اوکے.... تھینک یو ویری مچ!"

"بس یہی بات تھی خالہ جانی؟"

"ہاں.... بائی دی وے' تم خیریت سے تو پہنچ گئیں نا؟"

وہ یوں ہنسی جیسے میں نے کوئی بے وقوفانہ بات کہہ دی ہو اور بولی "ابھی تو بات کر رہی ہوں آپ سے۔"

"اتنی دیر کیوں ہوئی؟"

"وہ.... رافع صاحب کو راستے میں اپنے کسی دوست سے ملنا تھا۔ وہاں دیر ہو گئی۔"

"تم کیوں گئیں.... کہتیں پہلے مجھے چھوڑ دیں۔"

"اچھا لگتا خالہ جانی!"

"یہ بھی تو اچھی بات نہیں کہ وہ اپنے کسی دوست سے ملنے گئے اور تمہیں ساتھ لے گئے۔۔۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ بھی اچھا نہیں لگا کہ انہوں نے تمہیں ساتھ لیا اور میرے آفس آ پہنچے۔۔۔ کوئی دیکھ لیتا تو؟"

"کون؟ کون دیکھ لیتا؟"

"کوئی بھی۔۔۔ کوئی بھی جاننے والا۔" میں نے توقف کیا پھر کہا۔

"کیا سوچتا وہ؟"

"فار گاڈ سیک خالہ جانی!" یادگار نے قدرے ناگواری سے کہا۔ "رافع صاحب میرے ڈیڈی کی عمر کے ہیں۔۔۔ کون کیا سوچتا ہے' مجھے کسی کی پروا نہیں۔"

میں اپنے اندیشوں اور وسوسوں پر شرمندہ ہو کر رہ گئی!

O☆O

مگر میرے اندیشوں اور وسوسوں میں یادگار اکیلی تو نہ تھی' رافع بھی تھا۔

اگلے چند دنوں میں رافع کی یادگار سے روز افزوں بے تکلفی نے مجھے ایک عجیب سی مشکل میں ڈال دیا۔ اس کا یادگار کو معنی خیز نظروں سے دیکھنا۔ اس کی ذو معنی باتیں۔ اس کے رموز و کنائے۔ میرے دل میں بدگمانیوں کی کڑیاں ملانے لگتے۔

میں دل کی سرگوشیوں کو واہمہ قرار دیتی۔ میری آنکھیں جو کچھ دیکھتیں' میں اسے اپنی کم نظری سے تعبیر کرتے ہوئے خود کو ٹال دیتی۔ میرے کان جو کچھ سنتے' میں اسے ضعفِ سماعت و عقل سمجھتی۔ میں شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ دبا کر بگولوں کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی!

اس شام میں بہت تھکی ہوئی دفتر سے گھر واپس ہوئی تھی۔ رافع کے آنے کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا۔ دوپہر کو یادگار نے مجھے فون کر کے کہا تھا "خالہ جانی! رافع صاحب آئے ہیں۔ لنچ کے لیے چائنیز کا پروگرام ہے۔ ہم آپ کو لینے آ رہے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ میں نہ جا سکوں گی۔"

"کیوں؟"

"آؤٹ ہو رہا ہے۔"

"لنچ بریک تو ہو گا نا؟"

"ہاں مگر مجھے انہی لوگوں کے ساتھ کھانا کھانا ہو گا۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔" اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر بولی۔ "تو پھر خالہ جانی؟"

میں چپ رہی۔

"مجھے بتائیے' میں کیا کروں؟"

"گھر ہی میں کھانا کھا لو۔"

"رافع صاحب مائنڈ نہ کر جائیں کہیں۔۔۔ پرسوں میں نے کہا تھا نا کسی روز چائنیز چلیں گے۔ وہ آ گئے۔۔۔ بتائیے نا میں کیا کروں۔"

"میں کیا بتاؤں۔"

"نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ چلی جاؤں۔۔۔ ان کے ساتھ؟"

"سوچ لو۔۔۔ تمہاری ماما کو پتا چلا تو وہ اعتراض کریں گی بلکہ مجھے بھی ڈانٹیں گی۔۔۔ یاد ہے نا اس روز جب انہیں پتا چلا کہ رافع نے تمہیں ہاسپٹل ڈراپ کیا تھا تو وہ کتنی خفا ہوئی تھیں۔"

"ماما تو بس۔۔۔" یادگار کے لہجے سے ناگواری عیاں تھی۔

"بری بات۔"

"خالہ جانی! I AM NOT A CHILD' ماما یہ بات کیوں نہیں تسلیم کر لیتیں کہ میں بچی نہیں ہوں۔"

"تم کتنی ہی بڑی ہو جاؤ' ہماری نظر میں ہمیشہ بچی ہی رہو گی۔"

ایک سرد آہ میرے سینے میں مچل کر رہ گئی۔ خوش قسمت تھی یادگار کہ اسے بچہ سمجھنے والے تھے ابھی اس دنیا میں! وہ جن کے سامنے میں خود کو بچہ سمجھا کرتی تھی ان کی تو شاید ہڈیاں بھی نہ رہی ہوں گی اب!

"نہیں۔۔۔ خالہ جانی! میں جا رہی ہوں ورنہ رافع صاحب مائنڈ کر جائیں گے۔"

"تمہاری مرضی!" اور میں کیا کہہ سکتی تھی۔

سہ پہر کو میں نے گھر فون کیا تو بتول نے بتایا کہ یادگار رافع کے ساتھ باہر گئی تھی اور اب اپنے کمرے میں پڑی سو رہی تھی۔

میں دفتر سے بہت تھکی ہوئی گھر لوٹی۔

بظاہر شام کو رافع کی آمد کا کوئی امکان نہ تھا مگر وہ آ پہنچا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا "سنا ہے آج بہت مصروف دن گزارا آپ نے؟"

"ہاں!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"چلیے کہیں باہر چلتے ہیں۔۔۔ آپ کو گھما پھرا کر تازہ دم کریں گے۔"

اوہ! کتنا خیال تھا اسے میرا۔ میں اپنے اندیشوں اور واہموں پر شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"سی سائیڈ پر گئے بہت دن ہو گئے مجھے' آج وہیں چلتے ہیں۔"

اوہ! سمندر سے تو مجھے عشق تھا۔

یادگار اپنے کمرے میں تھی اور غالباً ہاسپٹل جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ رافع کی آمد کی اسے خبر نہ تھی۔

سچ تو یہ تھا کہ میں اسے خبر دینا بھی نہ چاہتی تھی۔ رافع کے ساتھ میں اکیلی ہی ساحلِ سمندر پر جانا چاہتی تھی۔

اگر یادگار اس کے ساتھ اکیلی گھومنے پھرنے جا سکتی تھی تو میں کیوں نہیں! میں تو اس سے عمر' تجربہ' خود مختاری ہر اعتبار سے بہت آگے تھی۔

مگر جب یادگار لاؤنج میں آئی تو رافع نے اسے بھی ساحلِ سمندر پر چلنے کی دعوت دے ڈالی۔

میرا خیال تھا وہ اپنی ڈیوٹی کے باعث معذرت کر لے گی مگر وہ تو فوراً راضی ہو گئی اور اس نے ٹیلی فون سیٹ میرے سامنے دھرتے

ہوئے کہا "خالہ جانی! آپ ہاسپٹل فون کر کے کہہ دیں' یادگار آج کسی ایمرجنسی کی وجہ سے ڈیوٹی پر نہ آ سکے گی۔"

"جھوٹ!" میں نے یادگار کو تنبیہی نظروں اور بظاہر محبت سے دیکھا مگر میرے دل میں ناگواری تھی۔

"سچ بولنے کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ہے ہم نے۔" یادگار مسکرائی۔ مجھے بادلِ ناخواستہ ہاسپٹل فون کرنا پڑا۔ رافع خوش دکھائی دیتا تھا۔ میں نے یادگار کو دیکھا اور میرے دل میں یک بیک رشک کا طوفان امنڈ آیا۔

پرنٹڈ کاٹن سوٹ' پنسل ہیل کورٹ شوز اور پھولے پھولے گھنے بالوں میں وہ بلا کی خوب صورت لگ رہی تھی۔

میں بھی تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

میرے تلوے دکھ رہے تھے مگر میں نے ہائی ہیل کورٹ شوز پہنے۔ بالوں کو یادگار کا ہیئر اسٹائل دینے کی کوشش کی۔ گہرا میک اپ کیا۔ راستے بھر یادگار جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی رہی۔ خدا جانے کیوں اتنا زیادہ بولنے لگی تھی وہ!

ساحل پر ہم نے اکٹھے چہل قدمی شروع کی۔ یادگار درمیان میں تھی۔ میں اس کے دائیں جانب اور رافع بائیں جانب حالانکہ ... میں رافع کے پہلو بہ پہلو چلنا چاہتی تھی!

یادگار پنسل ہیل کورٹ شوز پر بڑے کروفر سے چل رہی تھی۔ ذرا ڈگمگاہٹ نہ تھی اس کے قدموں میں۔ میں بھی اپنے تلووں کی دکھن کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے یادگار سے بھی زیادہ تن کر چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"وہ......" یادگار نے دور ایک چٹان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "وہاں تک جائیں گے ہم۔"

"اوکے!" رافع نے تائید کی۔

رافع اور یادگار تیز تیز چلنے لگے۔ میں ان کا ساتھ نہ دے سکی اور پیچھے رہ گئی!

میرے پاؤں بری طرح دکھ رہے تھے۔ ہائی ہیل کورٹ شوز پر چلنا قدم بہ قدم مشکل ہوتا جا رہا تھا اور میں رافع اور یادگار کے ساتھ نہ سہی ان کے پیچھے پیچھے ہی چلنے کی کوشش میں ہانپے جا رہی تھی۔ مجھے یادگار پر غصہ آ رہا تھا "عجیب ہے یہ لڑکی بھی! اس چٹان تک جا کر تو جیسے لڈو ملنے تھے۔" میں دل ہی دل میں کھول رہی تھی۔

مجھے اپنے اوپر بھی غصہ آ رہا تھا کہ کیوں میں یادگار کی دیکھا دیکھی ہائی ہیل جوتے پہن آئی تھی۔

اچانک یادگار تھم گئی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور استفہامیہ لہجے میں بہ آوازِ بلند بولی "تھک گئیں خالہ جانی؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں تو۔" میں رافع پر اپنی کمزوری کا اظہار نہیں ہونے دینا چاہتی تھی مگر شاید میں اونچی ایڑی کے جوتوں پر اپنی ڈگمگاہٹ کو یادگار کی نظروں سے نہ چھپا سکی۔

"آپ کو ہائی ہیلز نہیں پہننی چاہئے تھیں۔" یادگار نے ترحم سے میرے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے اس کی ترحم آمیز نظروں میں نہ جانے کیوں استہزا سا محسوس ہوا۔

"نہیں... نہیں۔" میں نے اپنی ڈگمگاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔" میں ان تک جا پہنچی تھی۔

"آپ سے چلا نہیں جا رہا تو آپ یہیں ٹھہریں... ہم دونوں ابھی آتے ہیں۔" رافع نے کہا۔

میرے دل پر جیسے ضرب سی لگی۔ میں نے گھائل نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم ابھی آتے ہیں۔" اس نے دوبارہ کہا پھر یادگار کی جانب مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولا "چلو جی۔"

"اوکے خالہ جانی!" یادگار نے کہا اور رافع کے ساتھ چل دی۔

"تمہاری خالہ پر بڑھاپا آ گیا ہے۔" میں نے رافع کو یادگار سے کہتے سنا۔

میرے کانوں میں جیسے سیسہ اترتا چلا گیا۔

میں چند لمحے صدمے کی کیفیت میں دم بخود کھڑی انہیں جاتے دیکھتی رہی پھر مجھے یوں لگا جیسے پیروں کی طرف سے میری جان نکلنا شروع ہو گئی ہو۔ پہلے میرے پاؤں بے دم ہوئے پھر ٹانگیں بے جان ہوئیں اور میں یوں نیچے بیٹھتی چلی گئی جیسے کوئی فلک بوس عمارت بم کے دھماکے سے زمیں بوس ہو جائے!

میں نے سمندر کے رخ دیکھا۔ سمندر کی نمی میری آنکھوں میں اتر آئی۔

رافع اور یادگار مجھے دھندلے دھندلے سے دکھائی دیے۔

میں نے اپنے پیروں سے جوتے یوں اتارے جیسے کوئی شخص اپنی زندگی کی پونجی داؤ پر لگانے کی تیاری کرے۔

میں نے دونوں زانو سینے سے لگائے اور بازوؤں کو اپنے گھٹنوں کے گرد باندھ کر سر گھٹنوں پر دھر لیا۔

میرے تصور میں ایک چھوٹی سی لڑکی فراک پہنے' بالوں کی دو ننھی ننھی پونیاں باندھے' ہنستی مسکراتی بڑی بے فکری سے قلانچیں بھرتی پھرنے لگی۔ اچانک ابو جی نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اپنے سینے سے لگایا اور پیار کرتے ہوئے بولے "یہ میری بیٹی نہیں' بیٹا ہے بیٹا۔"

وہ چھوٹی سی لڑکی اترانے لگی۔

اترائی ہوئی وہ لڑکی میں تھی!

اسکول کے احاطے میں ایک لڑکی ایک ٹانگ اوپر اٹھائے دوسری پر اچھل اچھل کر پہل دوج کھیل رہی تھی اور گھر پر گھر بسا رہی تھی۔

وہ بھی میں تھی!

کالج میں لڑکوں سے بھرے ایک کلاس روم میں دو لڑکیاں انتہائی اگلی نشستوں پر پہلو بہ پہلو بیٹھی تھیں اور ان میں سے ایک لڑکی دوسری کی کھلی ہوئی نوٹ بک پر لکھ رہی تھی "بائیں طرف

دوسری رو میں بیٹھا ایک لڑکا تمہیں گھور رہا ہے۔"

جس لڑکی کی نوٹ بک پر لکھا گیا تھا وہ بھی میں ہی تھی!

پھر ایک لڑکی میری چشمِ تصور میں زندگی کے راستوں پر بڑی مستعدی سے لپکتی جھپکتی دکھائی دینے لگی۔ کبھی فیکٹری میں ابوجی کا بوجھ بٹاتی' کبھی امی جان کے لیے پانوں کی تلاش میں سرگرداں۔ کبھی منجھلی آپا کی شادی کی تیاریوں میں منہمک' کبھی بڑی آپا کے جہیز کی تیاری میں دکان دردکان جھانکتی۔ کبھی رعنا کو وداع کرتی' کبھی سعدیہ کو رخصت کرتی' کبھی منجھلی آپا کو دلاسا دیتی' کبھی ننھی یادگار کو بہلاتی۔ کبھی ابوجی کی تکفین وتدفین کے انتظامات کرتی اور کبھی امی جان کی جدائی میں چپکے چپکے گھٹ گھٹ کر روتی ہوئی!

زندگی کے اتنے بہت سے راستوں پر دوڑتی بھاگتی وہ لڑکی بھی میں ہی تھی!

کیسی فعال ہوا کرتی تھی میں! اور کتنی توانائیاں تھیں مجھ میں! سب تھک جاتے' میں نہ تھکتی تھی۔

فیکٹری کی مصروفیات ہوتیں یا گھر کے روز مرّہ معمولات' کسی بہن کی شادی کی تیاری ہوتی یا کوئی بیماری آزاری' تھکن کو میں اپنے قریب پھٹکنے ہی نہ دیتی تھی۔

مگر اب۔۔۔! اب میں تھکنے لگی تھی۔ پہلے کی سی بات ہی نہ رہی تھی۔ نہ وہ ہمت نہ وہ توانائی۔

آج تو میں ایسی تھک کر ڈھے گئی تھی سمندر کنارے کہ خود کو کھڑا ہی نہ کر پا رہی تھی۔

اپنی بے بسی پر میرا دل کچے پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ آنکھوں میں اتری سیلن رقیق ہو کر چھلکنے کو بے تاب ہو گئی۔

مجھے یوں لگا جیسے میں برسوں بلکہ قرنوں سے اسی ساحل پر بیٹھی تھی اور اتنی بوڑھی ہو گئی تھی کہ اب اٹھنے کی سکت نہ پا رہی تھی۔

ہاں شاید قرن ہی بیت گئے تھے! رافع اور یادگار واپس لوٹ چکے تھے اور رافع میرے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہہ رہا تھا "صاحب! فیکٹری گئی جہنم میں' ایک پرائیویٹ ہاسپٹل کے پراجیکٹ پر کام کریں گے اب ہم۔"

میں نے اپنی دونوں آنکھوں کو جلدی سے پونچھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ دونوں میری آنکھوں میں رقت دیکھ پائیں۔

شاید ان کے پاس اتنی فرصت تھی بھی نہیں یا پھر وہ مگن بہت تھے!

"خالہ جانی! آپ کو تو پتا ہے نا میں ہمیشہ اپنے ہاسپٹل کے خواب دیکھا کرتی تھی جہاں امیروں کی کھال ادھیڑی جائے' غریبوں کا علاج مفت ہو۔" یادگار بولی۔

"اور اس کا نام ہوگا یادگار ہاسپٹل!" رافع کے لہجے سے سرخوشی ٹپک رہی تھی۔

میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اچھا ہے نا نام؟"

میں چپ رہی۔ دم بخود رہی! "اور ہم دونوں نے یہ بھی طے کرلیا ہے خالہ جانی! کہ ہمارے ہاسپٹل کی ایڈمنسٹریٹر آپ ہوں گی۔" یادگار بہت خوش نظر آرہی تھی۔

ہم دونوں! ہمارے ہاسپٹل! کس قدر معنی خیز تھے یہ الفاظ۔

"مس حبیبہ دی گریٹ! ایڈمنسٹریٹر یادگار ہاسپٹل!" رافع بولا۔

مس حبیبہ!

"میں تھک گئی ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے کسی کے سامنے تھکن کا اعتراف کیا تھا!

رافع اور یادگار اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اٹھنے سے پہلے دونوں کو باری باری دیکھا۔ رافع یادگار کو گہری اور معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ زیرِلب مسکرا رہی تھی۔

تنہائی کا احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا!

○☆○

میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ رافع ہاسپٹل کے پراجیکٹ پر اتنی سرعت سے کام کرے گا!

ساحلِ سمندر پر گزاری ہوئی اس شام کے چار دن بعد میرا برتھ ڈے تھا۔

میرا جنم دن میرے لیے اور دنوں کی طرح ایک عام سا دن تھا۔ ہنگامہ ہائے زندگی نے اس دن کو بطور خاص یاد رکھنے یا کوئی جشن منانے کی فرصت ہی نہیں دی تھی کبھی۔ دوسرے بھی یاد نہ رکھتے تھے۔

برس کے برس یہ دن آتا اور چپ چاپ گزر جاتا مگر اس مرتبہ یادگار نے نہ جانے کیوں رافع کو بتا دیا۔ اس شام میں گھر پہنچی تو احاطے میں رافع کی کار کھڑی تھی۔

لاؤنج میں داخل ہوئی تو وہ دونوں میری سالگرہ کا جشن منانے کے انتظامات کیے بیٹھے تھے اور نہ جانے کس بات پر بڑی بے ساختگی سے ہنس رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی ہنسی تھم گئی۔

دونوں ایک ساتھ اٹھے اور "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" گاتے ہوئے میری جانب بڑھے۔

"تھینک یو سو مچ!" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

میز پر کیک اور دوسری اشیائے خورونوش آراستہ تھیں اور پھول دار کاغذ میں لپٹے دو ڈبے میز پر پہلو بہ پہلو دھرے تھے۔ ان میں سے ایک پر ایک تہنیتی کارڈ چسپاں تھا۔

رافع نے کارڈ والا ڈبا اٹھایا اور مجھے دیتے ہوئے بولا "مَنی ہیپی ریٹرنس آف دی ڈے۔"

جانے کیوں میرا جی بھر آیا "اس کی کیا ضرورت تھی!" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"خاتونِ معظم!" وہ مسکراتے ہوئے بولا "تحفہ شکریے کے ساتھ قبول کرلیا کرتے ہیں۔"

میں خجل ہو گئی "تھینک یو!" میں نے ڈبا تھام لیا۔

وہ مسکرایا پھر دوسرا ڈبا میز پر سے اٹھا کر یادگار کی طرف

بڑھاتے ہوئے بولا "یہ تمہارے لیے ہے۔"

"میرے لیے! وہ کس خوشی میں؟"

"کس خوشی میں؟" رافع نے مسکراتے ہوئے اس کے الفاظ دہرائے اور سوچ میں پڑ گیا۔

"جلدی بتائیے۔" یادگار بولی "کیوں کہ میں یہ دیکھنے کے لیے بے چین ہوئی جا رہی ہوں کہ آخر اس پیکٹ کے اندر ہے کیا۔"

"ٹھیک ہے' تم دیکھ لو۔"

"پہلے آپ سبب تو بتائیے۔"

"سبب سمجھو وہی ہے جو میں نے تمہیں بتایا تھا۔"

میں نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔

"کیا بتایا تھا!" یادگار بولی۔

"بھئی یہی کہ ہاسپٹل کے لیے جگہ دیکھ لی ہے ہم نے۔"

"ارے ہاں خالہ جانی۔" یادگار میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ "انہوں نے ہاسپٹل کے لیے کوئی کوٹھی دیکھی ہے بہت بڑی سی۔"

"انہوں نے!" یادگار کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔

"تم دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔" رافع نے کہا پھر میری طرف دیکھ کر بولا "اور آپ بھی پسند کریں گی۔"

میں چپ رہی "چلئے جناب! بسم اللہ کریں اور کیک کاٹیں۔" رافع نے کہا۔

"خالہ جانی! کیک اور باقی سب کچھ بھی یہی لائے ہیں۔" یادگار نے اپنا پیکٹ کھولتے ہوئے بتایا۔

"کیوں تکلیف کی آپ نے؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تکلف چھوڑیے اور کیک کاٹیے۔" رافع بولا۔

"میں ..... میں ذرا ..... ہاتھ منہ تو دھو آؤں۔"

تبھی یادگار کی آواز نے مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیا "خالہ جانی! ذرا آپ بھی تو اپنا گفٹ دکھائیے۔"

میں نے سنی ان سنی کر کے وہاں سے جانا چاہا مگر یادگار ٹھنک کر بولی "خالہ جانی پلیز!"

"تم پہلے اپنا گفٹ تو دیکھ لو۔" رافع نے اس سے کہا۔

"نہیں نہیں میں اور خالہ جانی ایک ساتھ اپنا اپنا پیکٹ کھولیں گے۔" یادگار اپنا ہاتھ روکے کھڑی تھی۔

"پلیز!" رافع نے مجھ سے کہا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گئی۔ وہ یقیناً یہی چاہتا تھا کہ یادگار کی خواہش کی تکمیل ہو۔ میں اپنا گفٹ کھولنے لگی۔ یادگار نے بھی پھولدار ..... کاغذ ڈبے پر سے اتار دیا۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنا اپنا گفٹ کا ڈبا کھولا۔

میرے ڈبے میں سرخ رنگ کا بے حد نفیس کامدار ریڈی میڈ سوٹ آراستہ تھا جب کہ یادگار کے ڈبے میں ہو بہو اسی کام کا مگر سیاہ رنگ کا جوڑا رکھا ہوا تھا۔

"بیوٹی فل!" یادگار بولی۔

"ارے!" رافع چونک کر بولا اور اگلے ہی لمحے اس نے میرے ہاتھ سے ڈبا لے کر یادگار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تمہارے لیے تو یہ تھا۔" اور یادگار والا ڈبا اس سے لے کر مجھے تھماتے ہوئے بولا "سوری! سیلز مین غلط ڈبے پر کارڈ لگا گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" یادگار چہک کر بولی "بعض غلطیاں خود بخود درست ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ خالہ جانی کے لیے تو اس عمر میں لال رنگ نہیں ہو سکتا۔"

نہ جانے کیوں میرا جی بھر آیا۔ میری عمر تو جیسے میرے لیے سانحۂ عظیم بن گئی تھی! میں ہاتھ منہ دھو کر دوبارہ لاؤنج میں آئی تو یادگار رافع کا لایا ہوا سرخ جوڑا پہنے شعلۂ جوالہ بنی بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے عاری ہونے کے باوجود دمک رہا تھا۔

اس کی سیاہ ریشمی زلفوں اور تاباں چہرے میں ایک حسین تعلق نظر آتا تھا! وہ بلا کی دلکش لگ رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں دل ہی دل میں اس کی بلائیں لے ڈالتی۔ میں ایسا کیا بھی کرتی تھی مگر ......؟ رافع نے میرے اور یادگار کے تعلق کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے دل میں ایک کسک سی اٹھی!

کبھی میں بھی یادگار کی طرح بلکہ شاید اس سے زیادہ رعنائی کا پیکر ہوا کرتی تھی۔ میری دلکشی مصنوعی اور عارضی سہاروں کی محتاج نہ تھی۔ میرے چہرے پر صباحت تھی' ملاحت تھی مگر اب .....!

آہ! عجیب چیز ہے جوانی بھی اور بڑا ستم گر ہے وقت! کیا سے کیا بنا دیتا ہے یہ ہم انسانوں کی صورتوں کو! کس بے دردی سے بگاڑتا ہے یہ ہمارے چہروں کو!

آہ! کاش! وقت کا پہیہ الٹا گھمایا جا سکتا۔

میں نے کیک کاٹا۔ رافع اور یادگار نے ہیپی برتھ ڈے گایا۔ دونوں بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ میرے دل میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ یادگار کا نو دمیدہ چہرہ مجھے ایک احساسِ محرومی سے دوچار کر رہا تھا۔

رافع نے میرے جنم دن کو باہر گھومنے پھرنے اور رات کو باہر کھانا کھانے کا جواز بنانے کی کوشش کی مگر میں نے معذرت کر لی۔

"خالہ جانی! چلیں نا۔" یادگار نے اصرار کیا۔

"نہیں' میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"کیوں؟"

"بس۔"

"چلیں نا۔" وہ ٹھنکی۔

"پلیز!" میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"پلیز!" وہ لجاجت سے بولی۔

"چلئے نا' یادگار اتنے پیار سے کہہ رہی ہیں۔" رافع نے سفارش کی۔

یک بیک میرے جبڑے آپ ہی آپ بھنچ سے گئے اور میرے سینے میں ایک ہیجانی کیفیت نے سر ابھارا "رافع احمد!" میں نے دل ہی دل میں کہا "میں سب جانتی ہوں ..... جانتی ہوں کہ تم کیوں سفارش کر رہے ہو ..... یو چیٹ! تمہیں مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں .....

مجھے سیڑھی بنا کر تم یادگار پر کمند ڈالنا چاہتے ہو بلکہ شاید ڈال بھی چکے ہو۔۔۔۔ مگر میں تمہیں اس سے آگے نہیں بڑھنے دوں گی۔"

"سوری!" میں نے رافع کی سفارش سن کر دوٹوک لہجے میں کہا۔ "میرے سر میں درد ہے۔"

رافع نے یادگار کو دیکھا "رہنے دیں۔۔۔ خالہ جانی کے سر میں درد ہے۔ آج نہیں جاتے پھر کبھی سہی۔" یادگار بولی۔ رافع نے منہ لٹکاتے ہوئے شانے اچکائے۔ اسے مایوس و ناشاد دیکھ کر مجھے یک گونہ تسکین ملی۔

مگر یہ تسکین و طمانیت عارضی ثابت ہوئی!

O☆O

ابو جی مجھے اپنا عقل مند بیٹا کہا کرتے تھے مگر یہ تو میں نے ہی جانا کہ میں کتنی نادان تھی!

میں چراغِ آخرِ شب نہ سہی، اوّلِ شب سہی مگر سورج کے سامنے چراغِ اوّلِ شب کی بھی کیا حیثیت!

یادگار کے سامنے میرا چراغ کہاں جل سکتا تھا بھلا!

میری غلطی یہی تھی کہ میں نے رافع کو چراغِ اوّلِ شب تھا کر سورج کے سامنے لے جا کھڑا کیا۔ اس کی تو آنکھیں چندھیا گئیں۔

اگرچہ یادگار رافع کو بلحاظِ عمر اپنے مرحوم باپ سے نسبت دے کر میرے اندیشوں کو شرمندہ کر چکی تھی مگر رافع سے اس کی روز افزوں بے تکلفی اور رافع کے رموز و کنائے مجھے مجبور کر رہے تھے کہ میں یادگار کو محتاط رہنے کی تلقین کروں۔ یہ میرا فرض بھی بنتا تھا۔ منجھلی آپا نے اسے میرے ہی سپرد تو کر رکھا تھا مگر وہ بچی نہ تھی۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھی۔ اس سے بات کرنے کے لیے کوئی مناسب موقع اور ڈھنگ چاہیے تھا مجھے۔

میرے جنم دن کے چند ہی دن بعد ایک روز یادگار نے مجھے اطلاع دی "خالہ جانی! آج رافع صاحب مجھے وہ کوٹھی دکھانے لے گئے تھے جو وہ ہاسپٹل کے لیے خرید رہے ہیں۔"

میں نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"بہت بڑی اور شاندار کوٹھی ہے خالہ جانی۔۔۔۔ بہت موقع کی جگہ پر۔۔۔۔ بالکل مین روڈ پر زبردست ہاسپٹل بنے گا۔"

میں اسے دیکھتی رہی۔

"کیا بات ہے خالہ جانی؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں۔"

"بیٹھو۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

وہ مجھے متذبذب نظروں سے دیکھتی میرے نزدیک بیٹھ گئی۔

"مجھے رافع کے ساتھ تمہارا یوں آنا جانا بالکل پسند نہیں ہے یادو۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا خالہ جانی؟" وہ چونک کر بولی۔

"رافع لاکھ تمہارے باپ کی عمر کے سہی مگر ہیں تو غیر ہی۔۔۔۔ ان کے ساتھ تمہارا یوں کھلے بندوں آنا جانا ٹھیک نہیں۔۔۔۔ لوگ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔"

"مجھے پروا نہیں خالہ جانی۔" وہ بڑی بے پروائی سے بولی۔ "ویسے بھی رافع صاحب اور میں شادی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کی دھڑکن تھم گئی تھی! "شادی! فیصلہ!" مجھے اپنی آواز کوسوں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"جی ہاں۔" وہ بہت اطمینان سے بولی "وہ جلد ہی آپ سے بات کریں گے۔۔۔۔ ہاسپٹل کی عمارت وہ میرے نام سے خریدنا چاہتے ہیں اس لیے جلد شادی ضروری ہو گئی ہے۔"

میں صدمے کی کیفیت پر قدرے قابو پانے میں کامیاب ہو سکی تو میں نے کہا "بے وقوف مت بنو یادو۔۔۔۔ رافع بہت تیز آدمی ہیں۔"

"خالہ جانی! آج کی دنیا میں تیز آدمی ہی کامیاب ہے۔ سیدھے سادے آدمی کو تو لوگ کھا جاتے ہیں۔"

"تمہاری ماما راضی نہیں ہوں گی بلکہ۔۔۔۔ کوئی بھی راضی نہیں ہو گا۔"

"کیوں؟" اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"رافع تمہارے باپ کی عمر کے ہیں۔"

"اسی لیے تو وہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑی طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔

"خالہ جانی! میں نے۔۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں ایک ایسے آدمی کی کمی کو ہمیشہ شدت سے محسوس کیا جس کے بال کچھ کالے کچھ سفید ہوں۔ جو ہینڈسم ہو، جنٹلمین ہو اور میرا خیال رکھ سکے، مجھے تحفظ کا احساس دے سکے۔۔۔۔ رافع صاحب میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔"

"تمہاری ماما کسی قیمت پر اجازت نہیں دیں گی تمہیں اس بات کی کہ تم۔۔۔۔ تم رافع سے۔۔۔۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اپنی زندگی مجھے گزارنی ہے خالہ جانی۔۔۔ ماما کو اگر ڈیڈی کے بعد دوسری شادی کا حق تھا تو مجھے بھی یہ حق ہے کہ میں اپنی زندگی کا فیصلہ کر سکوں۔۔۔۔ میں بچی تو نہیں ہوں، اپنا برا بھلا سمجھتی ہوں۔"

"ہاں۔" میں نے گھٹی گھٹی ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے سوچا "ہر ایک کو اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق ہے۔۔۔ سوائے میرے!"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ اب تک میں نے اپنی زندگی اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے گزاری تھی۔ میرے کاسۂ حیات میں اب بچا ہی کیا تھا۔ شاید چند سال یا کون جانے کہ وہ بھی نہیں!

کبھی اپنی پرانی تصویریں دیکھتی تو میرا دل دکھنے لگتا۔ کیا سے کیا ہو گئی تھی میں! دوسروں کی خاطر زندگی گزارتے گزارتے۔

اپنی زندگی پر کچھ حق خود میرا بھی تھا کہ نہیں!

میرا کلیجا منہ کو آنے لگا۔ یادگار اک شانِ استغنا سے میرے پاس سے اٹھی اور چلی گئی۔

میری آنکھیں بھر آئیں۔ کیا نہیں کیا تھا میں نے یادگار کے لیے۔ اتنی نادان تو نہیں تھی وہ کہ رافع سے میری جذباتی وابستگی کا اندازہ نہ کرپائی ہوگی۔ پھر بھی.... پھر بھی اس نے رافع سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔

اس کے پاس تو ابھی بہت وقت تھا اور دنیا میں اچھے لڑکوں.... اچھے مردوں کا بھی کال تو نہ پڑگیا تھا۔ پھر بھی.....!

میرے رگ و پے میں ایک جارحانہ لہر اٹھی۔

"مجھ پر میری اپنی ذات کا بھی کچھ حق ہے.... اب میں اپنے لیے جیوں گی.... رافع مجھے ملے یا نہ ملے..... میں وہ نہ ہونے دوں گی جو وہ چاہتا ہے۔" میں نے سوچا۔

مجھے لڑنا تھا۔

اپنے آپ سے!

یادگار سے!

رافع سے!

O☆O

"یہ نہیں ہوسکتا۔" میں نے رافع سے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میری دماغی صحت مشکوک لگی ہو۔

"گھر بھر میں کوئی راضی نہ ہوگا۔"

"آپ کے گھر میں ہے ہی کون!" وہ یوں مسکرایا جیسے اس نے میری کوئی فاش غلطی پکڑلی ہو۔

"میرا مطلب ہے خاندان بھر میں کوئی راضی نہ ہوگا۔" میں نے قدرے خفیف ہوکر کہا۔

"کیا فرق پڑتا ہے! میں اور یادگار تو راضی ہیں۔"

"یادگار تو بے وقوف ہے.... ناسمجھ ہے وہ۔"

"آپ غالباً بھول رہی ہیں کہ وہ ڈگری یافتہ ڈاکٹر ہے۔"

"آپ.... آپ سمجھ کیوں نہیں رہے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"میں تو سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔" اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔

اس کی نظروں کی کاٹ کی تاب نہ لاکر میں نے نظریں چرالیں۔

"جسے آپ بے وقوف اور ناسمجھ کہہ رہی ہیں' میرے خیال میں تو وہ آپ سے زیادہ سمجھ دار اور عقل مند ہے۔"

شاید! شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں بے وقوف اور ناسمجھ نہ ہوتی تو.... ! مجھے ادا کا ایک شعر یاد آنے لگا۔

زندگی اتنی رائگاں تو نہ تھی

جانے کس رہ گزر میں بھول آئی!

میری نگاہیں رافع کی نظروں سے ملیں۔ وہ مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ایک استہزا تھا۔

میں تلملا کر رہ گئی۔ اس کی استہزائیہ نظریں میرے وجود کے آرپار ہوئی جارہی تھیں..... آزار پہنچارہی تھیں مجھے۔

واو کے! او کے مسٹر رافع! زیادہ خوش مت ہو۔ مسکراؤ مت۔ میں بھی.... میں بھی تمہیں یوں ہی استہزا سے دیکھوں گی۔ آزار پہنچاؤں گی تمہیں اور تلملانے پر مجبور کردوں گی تمہیں۔

"یادگار آپ سے.... آپ سے.... بہت.... بہت چھوٹی ہے..... آپ اس کے باپ کی عمر کے ہیں۔" میں نے کہا اور مجھے اپنی آنکھوں میں ایک استہزائیہ کیفیت کا احساس ہوا۔

وہ بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ میں بھی ہکا بکا اس کا منہ دیکھتی رہی۔ کہیں پاگل تو نہیں ہوگیا تھا وہ جو... یوں ہنس رہا تھا!

اس کا قہقہہ تھما تو وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جناب! کس دنیا میں رہ رہی ہیں آپ! جب دل مل جائیں تو عمروں کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا......" اس نے توقف کیا پھر انتہائی سنجیدگی سے بولا "مغرب میں تو اسی سال کا بوڑھا بڑے ٹھاٹ سے ٹین ایجر لڑکی سے شادی کرتا ہے اور لڑکی ایک ایک کو خوش ہوکر بتاتی ہے کہ وہ پردادا نما مرد اس کا شوہر ہے۔"

"مشرق میں بھی ایسا ہوتا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"یہاں بھی پھول سی نو عمر لڑکیاں پختہ عمر مردوں سے بیاہ دی جاتی ہیں مگر اڑتالیس برس کی ایک ناکتخدا خاتون اپنے ہم عمر اور سابقہ ہم جماعت کی ہم سفری کا فقط خواب دیکھ سکتی ہے' تعبیر نہیں پاتی۔"

O☆O

مجھلی آپا کو پتا چلا تو وہ دم بخود رہ گئیں "ادھر کی دنیا ادھر ہوجائے' یہ نہیں ہوگا۔" انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

مگر یادگار کا ارادہ اٹل رہا! مجھلی آپا ہی نہیں' سب نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی مگر وہ ذرا پیچھے نہ ہٹی۔

سارا دوش مجھ پر آرہا "غلطی تمہاری ہے حبیبہ۔" مجھلی آپا نے کہا "نہ تم ایک غیر شخص کو گھر میں گھساتیں نہ یہ ہوتا۔"

اوروں نے مجھلی آپا کی بات کی تائید کی۔

"میرا تو وہ کلاس میٹ تھا۔"

"کلاس میٹ تھا تو کیا ہوا' گھر میں جوان بچی بھی تو تھی۔" بڑی آپا نے کہا۔

میں نے سر جھکالیا۔ یادگار کو ایک مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا خالہ جانی! کہ آپ لوگ اتنی مخالفت کیوں کررہے ہیں۔" وہ زچ نظر آتی تھی۔

"ہم تمہارا برا نہیں چاہتے.... رافع کا اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں.... تم دونوں کی عمروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"اوہ! اوہ خالہ جانی! عمر کے فرق کو کیوں مسئلہ بنالیا ہے آپ لوگوں نے!" وہ منہ بنا کر بولی پھر اس نے قدرے توقف سے کہا۔

"جانتی ہیں طبی نکتہ نظر سے مرد اور عورت کی عمروں کے درمیان آئیڈیل نسبت کیا سمجھی جاتی ہے؟"

میں چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ بولنے کی جا کہاں تھی۔
یادگار کوئی سیدھی سادی اور دوسروں کی مرضی کی پابند رہنے والی لڑکی تو تھی نہیں۔

"مرد کی عمر کو دو سے تقسیم کر کے اس میں آٹھ جمع کرنے کے بعد جو عدد حاصل ہو' اس عمر کی عورت اس مرد کے لیے بلحاظ عمر مناسب ترین سمجھی جاتی ہے.... فرض کیجئے رافع اگر پینتالیس سال کے بھی ہوئے تو ان کی لائف پارٹنر کو تیس اکتیس سال کی ہونا چاہیے..... اور میں چھبیس سال کی تو ہو ہی چکی ہوں۔"

"رافع پینتالیس نہیں' پچاس کے لگ بھگ ہیں۔" میں نے جتایا۔

"کوئی بات نہیں۔" یادگار نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"تم بہت بڑی غلطی کرو گی یادگار!" میں نے کہا۔

وہ دھیرے سے یوں مسکرا دی جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہی ہو۔ اس کی مسکراہٹ پر میں دل ہی دل میں کھول کر رہ گئی۔

"خالہ جانی! غلطی کیے بغیر ہم انسان سیکھتے بھی تو نہیں۔"

اوہ! کیسی شاطر ہو گئی تھی یادگار!

یادگار میرے روبرو آ کھڑی ہوئی اور اس نے اپنے بازو میری گردن میں حمائل کرتے ہوئے کہا "میں جانتی ہوں..... میں جانتی ہوں خالہ جانی! کہ آپ کو مجھ سے بہت محبت ہے۔ شاید ماما سے بھی زیادہ۔"

میرا دل بھر آیا پھر آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

یادگار نے میری کیفیت تاڑ لی "پلیز! پلیز خالہ جانی۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

اچانک ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

یادگار بے تابانہ میرے آنسو پونچھنے لگی "خالہ جانی..... خالہ جانی! روئیں مت..... پلیز مت روئیں..... مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میرا بہت خیال ہے۔ مجھے کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتیں آپ..... لیکن..... لیکن رافع بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

آہ! یادگار یہ سمجھ رہی تھی کہ میں اس کے لیے رو رہی تھی!

"خالہ جانی! بڑی عمر کے مرد نوجوانوں کے مقابلے میں زیادہ STABLISHED ہوتے ہیں..... میں نے سنا ہے زیادہ خیال رکھتے ہیں اپنی لائف پارٹنر کا اور..... اور زیادہ وفادار ہوتے ہیں مجھے یقین ہے خالہ جانی! میں اپنے فیصلے پر پچھتاؤں گی نہیں۔"

اوہ! کتنی دانشمند تھی یادگار!

میں نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا اور کہا "ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لو۔"

وہ دھیرے سے مسکرا دی اور بولی "خالہ جانی! سوچنے کی گنجائش وہاں ہوتی ہے جہاں دل ڈانواں ڈول ہو..... ویسے بھی..... ویسے بھی خالہ جانی! کبھی نہ کبھی رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔"

میں اک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

یادگار کے رسک لینے پر نہیں' اپنی زندگی نہ جانے کس رہ گزر پر بھول آنے کے دکھ میں!

O☆O

میں نے اپنے اسکول کے زمانے میں ہر ہر سطر قہقہہ بار ہونے کا دعویٰ رکھنے والے رسالے کے ایک شمارے میں پڑھا تھا "عشق عورت کو بھی سرفروش بنا دیتا ہے۔"

منجھلی آپا نے جو ان دنوں یادگار کی طرف سے انتہائی پریشان تھیں' بڑی آپا کی موجودگی میں مجھ سے کہا "یادگار کو بتا دو کہ اگر وہ اپنے ارادے سے باز نہ آئی تو میں زندگی بھر اس کی صورت نہیں دیکھوں گی۔"

میرا خیال تھا' منجھلی آپا کی یہ بات یادگار کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دے گی مگر میرا خیال اک خیال خام ثابت ہوا۔ یادگار نے دوٹوک انداز میں کہا "نہ دیکھیں..... مجھے پروا نہیں۔"

مجھے تاؤ آ گیا "دیکھو یادگار! تمہیں پروا ہو یا نہ ہو' مجھے منجھلی آپا کی پروا ہے..... کیوں کہ وہ میری بہن ہیں..... اگر تم انہیں ناراض کرو گی تو میں بھی تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔"

یادگار نے ابرو چڑھا کر مجھے دیکھا اور بولی "کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں خالہ جانی کہ آپ بھی میری صورت نہیں دیکھیں گی!"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑی سرفروشانہ سی کیفیت تھی۔

یادگار کے اس انکشاف کے بعد کہ وہ اور رافع شادی کا فیصلہ کر چکے تھے' میرے لیے یہ سوال انتہائی تکلیف دہ بنا ہوا تھا کہ میں اس شخص کو جس کے خیالوں نے اس عمر میں میرے دل کو دوشیزگی بخش دی تھی' یادگار کے شریک زندگی کے روپ میں کیوں کر دیکھ اور قبول کر پاؤں گی! یہ لمحہ مجھے غنیمت محسوس ہوا۔

"کم از کم رافع کی صورت تو میں ہرگز نہیں دیکھنا چاہوں گی۔" میں نے دوٹوک لہجے میں مگر یادگار سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

تھینکس گاڈ! منجھلی آپا نے مجھے یادگار سے وہ بات کہنے کا جواز فراہم کر دیا تھا جو شاید میری انا اور بقا دونوں کا مسئلہ تھی!

میں اب واقعی رافع کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

بجا کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجی تھی۔ یہ بھی تسلیم کہ میرے اور رافع کے بیچ کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو میرا ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچا سکتی مگر یہ بھی تو سچ تھا کہ میری زندگی میں اس کی دوبارہ واپسی ہی نے میرے دل میں خود اپنی ذات سے محبت کی جوت جگائی تھی!

میں تو تھک چکی تھی اور خود کو یکسر بھلا بھی چکی تھی ... اسی کی آمد نے مجھے خود کو آواز دینے پر اکسایا تھا!

میں اس کی آمد اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی یادیں ایک خواب سمجھ کر بھول جانا چاہتی تھی۔

یادگار مجھ سمیت کسی کی مخالفت کو خاطر میں نہیں لائی۔ قانونی طور پر اپنی خود مختاری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے رافع سے

شادی کرلی۔

میں بہت روئی۔ سب کا خیال تھا یادگار کے لیے! مگر حقیقت تو میرا دل ہی جانتا تھا۔ دل! جو حقیقت آشنا بھی تھا اور میرا درد آشنا بھی۔

ہمارے وجود میں موجود یہ عضلاتی لوتھڑا کیا کچھ سہتا ہے! زندگی میں شاید کسی اور حادثے نے مجھے اتنا دکھی نہیں کیا تھا جتنا اس حادثے نے۔ میں دکھی بھی تھی اور خود اپنے آپ سے شرمندہ بھی!

کیوں؟ کیوں میں اس عمر میں خود فریبی کا شکار ہو گئی تھی۔

کیوں میں نے اس عمر میں وہ خواب دیکھے جو نوجوان لڑکیوں کی آنکھوں میں ہی بھلے لگتے ہیں۔

پندرہ دن تک میں نجی مصروفیات کے بہانے دفتر سے چھٹی پر رہی۔ بیماری کا بہانہ یوں نہ کیا کہ رفقائے کار عیادت کو آتے۔

O☆O

چھٹی ختم ہونے کے بعد میں دفتر گئی تو میرے دل میں یہ خدشہ تھا کہ شاید میرے رفقائے کار کو یادگار کی شادی کے قصے کا علم ہو چکا ہو۔ رافع ایم ڈی صاحب کا دوست تو تھا نا!

مگر وہاں سب لاعلم تھے۔ تھینکس گاڈ!

میرے رفقائے کار نے میری کمزوریِ صحت پر تاسف سے زیادہ حیرت کا اظہار کیا۔

اوہ میڈم! آپ کو کیا ہو گیا! کیا بیمار رہیں؟ بالکل بدل گئیں آپ تو!

میں کیا' میری تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ ایم ڈی صاحب تشویش سے بولے "خیریت تو رہی مس حبیبہ؟"

میں نے مشکوک نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ تجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ کر رہے تھے یا واقعی انہیں کچھ پتا نہ تھا۔ بظاہر تو وہ لاعلم ہی نظر آتے تھے۔

"جی سر!" میں نے ان کے استفسار کے جواب میں کہا۔

"بہت کمزور لگ رہی ہیں۔۔۔ کیا بیمار ہو گئی تھیں آپ؟"

میں نے ایم ڈی صاحب کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا "سر! رافع سے ملاقات نہیں ہوئی آپ کی؟"

ایم ڈی صاحب نے میری جانب یوں دیکھا جیسے قدرے حیران ہوں کہ ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے میں رافع کے بارے میں کیوں پوچھ رہی تھی پھر بولے "ملاقات تو کافی دن سے نہیں ہوئی البتہ دو روز پہلے گھر فون کرنے پر معلوم ہوا کہ موصوف دوسری شادی رچا کر ہنی مون کے لیے انگلستان گئے ہوئے ہیں۔"

رافع نے یادگار کے دل میں انگلستان دیکھنے کے جس شوق کو مہمیز دی تھی' بالآخر اس کی تکمیل ہو گئی تھی!

میں نے رافع پر اپنے گھر کے دروازے تو بند کردیے تھے لیکن اپنے دفتر کے دروازے تو اس پر بند نہیں کرسکتی تھی۔ ایم ڈی صاحب اس کے دوست تھے سو میں نے خود اپنے اوپر اس دفتر کے دروازے بند کیے اور نجی وجوہ کے بہانے استعفیٰ پیش کردیا۔

اپنے ان انتہائی اقدامات کا خود اپنے لیے میرے سامنے فقط ایک ہی جواز تھا کہ میں یادگار کے شوہر کی حیثیت سے رافع کا سامنا نہ کرسکوں گی!

O☆O

یادگار کی شادی نے مجھے بہت دنوں تک درہم برہم رکھا۔

میرا ذہن ایک عجیب سی بحرانی کیفیت کا شکار رہا۔ نوجوان لڑکیوں کے شگفتہ چہرے میرے دل میں اک ہوک سی بھر دیتے۔ ان کی چہلیں دیکھ کر مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ ان کے قہقہے میری سماعت میں گرم سیسے کی طرح اترتے۔

رافع نے مجھے اسی لیے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا تھا نا کہ میں یادگار کی طرح جوان نہیں تھی ورنہ۔۔۔۔۔! ورنہ اس کا اور میرا تعلق۔۔۔۔۔ اس کی اور میری شناسائی تو یادگار کے اس دنیا میں آنے سے بھی پہلے کی تھی۔

گو مجھے اس سے ہیر' سوہنی اور لیلیٰ کی سی محبت تو کبھی نہیں رہی تھی تاہم اک جذباتی وابستگی تو تھی جس نے اس سے دوبارہ ملنے پر مجھے برسوں پرانے مقام پر دوبارہ لے جا کھڑا کیا تھا۔

مگر افسوس کہ میرے خوش رنگ نفیس ملبوسات' میرے رنگے ہوئے بال اور میک اپ سے مزین میرا چہرہ بھی رافع کے دل کو نہ بھا سکے تھے!

مجھ پر قنوطیت طاری ہو چلی تھی! جلد ہی میں نے ایک نئی ملازمت ڈھونڈلی۔ بال ڈائی کرنا چھوڑ دیے۔ اپنے تمام شوخ رنگ ملبوسات، استعمال شدہ کاسمیٹکس اور استعمال کی دوسری بہت سی چیزیں میں نے جولن کو دے دیں۔
مجھے اب ان چیزوں کی کیا ضرورت تھی!

O☆O

فیکٹری کی طرح رافع کا اسپتال والا منصوبہ بھی تشنۂ تکمیل رہا۔
یادگار کو انگلستان اور وہاں کا رہن سہن اتنا پسند آیا کہ اس نے مستقل طور پر وہیں قیام پذیر ہونے کا فیصلہ کیا، رافع کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چناں چہ وہ دونوں اب وہیں رہتے ہیں۔ یادگار اور رافع کی شادی کو نو برس ہو چکے ہیں۔ ان کے تین بچے بھی ہیں۔
یادگار انیتا اور اس کے بچوں سے بھی ملی تھی۔ انیتا نے اس سے میرے بارے میں کیا کہا ہوگا، میں نے کبھی نہیں پوچھا نہ اس نے بتایا۔
یادگار برس کے برس نہ سہی، ہر دوسرے سال پاکستان ضرور آتی ہے۔
مجھ سمیت کوئی بھی اس سے زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہ سکا اور اس کی خاطر مجھے رافع کے لیے بھی اپنے گھر کا دروازہ دوبارہ کھولنا پڑا۔
کبھی کبھی بلکہ شاید اکثر ہمیں اپنے دل کے خلاف حالات سے بھی مفاہمت کرنا پڑتی ہے سو میں نے بھی زندگی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔
زندگی! زندگی کے ذکر پر مجھے ہر ہر سطر فقرہ بار ہونے کا دعویٰ رکھنے والے رسالے کے ایک شمارے میں پڑھے ہوئے یہ الفاظ یاد آگئے جو اپنی عمدہ یادداشت کے سبب مجھے آج بھی کچھ اس طرح یاد ہیں جیسے کل ہی پڑھے ہوں۔
"زندگی اور عورت ویسی ہی نظر آئیں جیسی کہ وہ درحقیقت ہوں تو ان گنت الجھنوں سے بچ جاتی ہیں۔" میں نے اپنی زندگی کو جیسی کہ وہ درحقیقت ہے، قبول کر چکی ہوں!
میرا چہرہ اور میرے بال ایک دوسرے کی چغلی نہیں کھاتے بلکہ ایک دوسرے سے میل کھاتے ہیں۔
میرے سفید بال دیکھ کر لوگوں کی نگاہوں میں احترام جھانکنے لگتا ہے۔
یادگار اب اپنے بارے میں پہلے کی طرح بے پروا نہیں رہی۔
اپنے بناؤ سنگار کا خاص خیال رکھتی ہے۔
اپنے بالوں میں رتی بھر بھی سفیدی نہ جھلکنے دینے کی خاطر وہ ہیئر ڈائی استعمال کرنے لگی ہے۔
اب اسے پہلے کی طرح پھیکے پھیکے رنگوں والے کپڑے نہیں بھاتے بلکہ اس کی نگہ انتخاب گہرے اور شوخ رنگوں پر ٹھہرتی ہے۔
کبھی کبھی وہ آئینے میں خود کو اتنی گہری نگاہوں سے دیکھتی ہے کہ مجھے اپنا زمانہ یاد آنے لگتا ہے۔
کم عمر لڑکیوں کو دیکھ کر اب اس کی آنکھوں میں بھی رشک ڈولنے لگتا ہے۔
آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی اس کی آنکھوں سے بھی تذبذب اور خوف کی ملی جلی کیفیت جھانکنے لگتی ہے۔
وہ اپنا چہرہ آئینے کے بے حد نزدیک لے جا کر کھوئی کھوئی نگاہوں سے خود کو دیکھنے لگتی ہے۔
ہم عورتیں اپنی بڑھتی عمر کے بارے میں کتنی کانشیس ہوتی ہیں!
شاید مرد بھی ہوتے ہوں۔
اب جب کبھی میں اپنے دل کو کھنگالتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اس وقت مجھے رافع کی بے اعتنائی کی نسبت مڈل ایج کرائسس بالفاظ دیگر، بحرانِ عمر رسیدگی نے زیادہ صدمہ پہنچایا تھا!
اف یہ مڈل ایج کرائسس!
صد شکر کہ میں اس بحران سے نکل چکی ہوں۔ میں نے اس حقیقت کو خواہ دکھتے دل کے ساتھ ہی سہی، بالآخر قبول کر لیا ہے کہ حسن اور جوانی کو بالآخر زوال ہے۔ جس کی زندگی نے تادیر وفا کی وہ بوڑھا بھی ضرور ہوا ہے۔ مجھ سے پہلے بھی لوگ جوانی کو خیرباد کہہ کر بوڑھے ہوتے رہے ہیں، میرے بعد بھی ہوتے رہیں گے.... تو پھر جھلاہٹ، مایوسی اور قنوطیت کیوں!
خواہ دیر ہی سے سہی، میں نے اپنے اسکول کے زمانے میں پڑھی ہوئی اس عبارت کی صداقت تسلیم کر لی ہے کہ زندگی اور عورت ویسی ہی نظر آئیں جیسی کہ وہ درحقیقت ہوں تو ان گنت الجھنوں سے بچ جاتی ہیں!
میں اب ویسی ہی نظر آتی ہوں جیسی کہ درحقیقت ہوں اور بہت مطمئن ہوں۔
زندگی کو تبدیلیوں کا عادی ہونا ہی پڑتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن یادگار بھی تبدیلیوں کی عادی ہو جائے گی۔
امی جان کی طرح اب مجھے بھی اپنا بچپن کبھی کبھی بہت یاد آتا ہے اور بچپن سے زیادہ جوانی! آہ جوانی!
گو میں نے زندگی کو اور خود اپنے آپ کو ویسا ہی قبول کر لیا ہے جیسی کہ درحقیقت ہیں مگر پھر بھی کبھی کبھی دل میں ایک کسک سی اٹھتی ہے۔
آج اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تیری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟ تو میں رافع کا نام لینے کے بجائے آنکھ بند کر کے کہوں گی! جوانی!
آہ جوانی! ہائے جوانی!
ایک بار دیکھا ہے، دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے!
کاش!
اے کاش؟